فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوارِ ربانی	قرآن کا معجزہ	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	7
قولِ نبیؐ	تحفے کا لین دین	بشریٰ تسنیم	12
خاص مضمون	رمضان کی برکات	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	14
	آزمائش میں راہِ عمل	افشاں نوید	21
حقیقت وافسانہ	جوگ	قانتہ رابعہ	24
	ایک یادگار تقریب	ڈاکٹر ام کلثوم	29
	بہار آئے گی	حمیرا خالد	33
	المیہ	فرحی نعیم	36
سلسلہ وار کہانی	دل کا دیا	نصرت یوسف	41
نمایاں خواتین کا تذکرہ	ملکہ زبیدہ	آسیہ راشد	51
خفتگانِ خاک	خوب تر تھا صبح کے.....	شاہدہ اکرام	55
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	60
ہلکا پھلکا	گولا کنڈا	حفصہ محمد افضال	66
قدرت کے خزانے	آم اور جامن	آسیہ راشد	69
محشر خیال	افشاں نوید، خورشید بیگم		72
	ایک مکتوب اور اس کا جواب	شہناز یونس	74
غذا اور صحت	تلپینہ کیا ہے؟	فریدہ خالد	77
بتول میگزین	ڈاکٹر شگفتہ نقوی، ڈاکٹر فلزہ آفاق، اُم فاطمہ		78

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! انتخابات ہو بھی چکے۔ حکومت سازی کا عمل شروع بھی ہو گیا، یعنی آئے بھی وہ گئے بھی وہ، مگر ہنگامہ بھی جاری ہے اور تبدیلی کا خواب بھی ہنوز تشنۂ تعبیر ہے۔ پاکستان میں جمہوری روایات کو مستحکم ہونے میں تو ابھی نہ جانے کتنا عرصہ لگے گا، مگر یہ بات خوش آئند ہے کہ اب کے انتخابی عمل کے دوران عوامی شعور کی سطح میں قدرے اضافہ نظر آیا۔ ٹرن آؤٹ پہلے سے زیادہ رہا خصوصاً شہری علاقوں میں جہاں ووٹ ڈالنے کے لئے گھر سے نکلنا ماضی میں ایک غیر مقبول عمل تھا، وہاں لوگ کئی کئی گھنٹے قطاروں میں انتظار کرتے نظر آئے۔

انتخابات اپنے مقررہ وقت پر ہوتے رہیں تو شعور کا یہ گراف بڑھتے رہنے کا واضح رجحان نظر آنے لگتا ہے، یہاں تک کہ آمریتیں اس عمل کو پھر غیر معینہ مدت کے لئے معطل کر دیتی ہیں۔ البتہ حالیہ انتخابات میں ایک بار پھر ثابت ہوا کہ جمہوری عمل میں تعطل کے بعد پاکستان میں جمہوریت کے استحکام میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔

ایک جاگیردارانہ نظام، جس کے تحت مقامی بااثر افراد پوری پوری آبادیوں کے ووٹ لالچ اور خوف کے ذریعے خرید لیتے ہیں، اور جہاں انسان کو رائے رکھنے یا رائے دینے کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا وہاں انسانی رائے پر بنیاد رکھنے والا نظام کیسے کامیاب ہو سکتا ہے!

دوسرا عنصر انتخابات میں دھاندلی کا ہے۔ 1977ء میں انتخابات میں کھلم کھلا دھاندلی کے خلاف تمام اپوزیشن جماعتیں سراپا احتجاج بن گئیں اور بھٹو صاحب کو اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بعدازاں ہونے والے خصوصاً 2008ء کے انتخابات کو بھی غیر ملکی مبصرین نے شفاف نہیں کہا، مگر جس وسیع پیمانے پر اس بار دھاندلی ریکارڈ کی گئی، اس نے 1977ء کے الیکشن کی یاد تازہ کر دی۔ میڈیا کے جدید ذرائع نے انتخابی عمل کی ''شفافیت'' کا پول کھول کر رکھ دیا۔ فافن کی جانب سے بھی اس بات کی تصدیق کی گئی۔

الیکشن کمیشن کا کردار بے حد افسوسناک رہا۔ تصاویر، ویڈیوز، واقعاتی شہادتوں اور بیانات کے باوجود الیکشن

کمیشن زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد کی تصویر بنا رہا۔ ملک بھر خصوصاً پنجاب میں ریٹرننگ افسروں نے نتائج تبدیل کیے۔ لاہور کے ایک حلقے میں متنازعہ طور پر ''جیتے'' ہوئے ن لیگ کے امیدوار میاں نواز شریف کے پہلو میں بیٹھے حکومت سازی پر صلاح ومشورہ کر رہے ہیں۔ میاں نواز شریف نے تو پانچ سال بڑے صبر سے اپنی ''باری'' کا انتظار کیا ہے اور اب وہ حکومت سازی کو اپنا استحقاق سمجھ رہے ہیں جس کی خاطر انہوں نے زرداری کی کرپٹ اور نااہل ترین حکومت کو پانچ سال تک قوم پر مسلط رکھا۔

پنجاب میں جو کچھ ن لیگ کے لئے ہوا، وہی بندوبست سندھ میں پیپلز پارٹی کے لئے تھا۔ گزشتہ پانچ سالہ کارکردگی کے بعد ہر شخص یہ سمجھ چکا تھا کہ پیپلز پارٹی کی سیاسی موت واقع ہو چکی ہے۔ خود پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو ووٹ ملنے کی امید بلکہ ووٹ مانگنے کے لئے انتخابی مہم چلانے کی بھی ہمت نہ تھی۔ آج وہ ایوان میں دوسری بڑی پارٹی قرار پائی ہے۔

تحریک انصاف والے انصاف مانگتے پھر رہے ہیں۔ کھلی دھاندلی کے ثبوت نہ بھی ہوتے تو شہروں خصوصاً لاہور میں پی ٹی آئی کی شکست ایک ناقابل یقین بات لگتی ہے۔ بلوچستان میں بھی سیاسی جماعتوں کو انتخابی عمل پر شدید تحفظات ہیں۔ کئی شہروں میں ووٹ کا عمل ہوئے بغیر گنتی کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔

سب سے زیادہ المناک صورتحال کراچی کی رہی، جہاں اس بار شہری بھتہ خوروں اور دہشت گردوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے پُرعزم تھے، مگر بھتہ مافیا کے آگے نگران حکومت، الیکشن کمیشن، فوج، اعلیٰ عدالتیں سب بے بس نظر آئیں۔ ایم کیو ایم کی دھمکیوں کے باعث جماعت اسلامی کو جس کی جیت کے واضح امکانات موجود تھے، انتخابی عمل کا بائیکاٹ کرنا پڑا۔ وہ الیکشن کمیشن جس کی طرف سے فوری شکایات درج کروانے کے لئے شہریوں کو فون نمبر مہیا کیے گئے تھے، اجنبی بن گیا۔ 11 مئی کے دن بارہ بجے سے ہی میڈیا پر اعلانات شروع ہو گئے۔ رینجرز الٹا غنڈوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ شدید خوف کے باوجود جماعت اسلامی کی پریس کانفرنس، دھرنے اور ریلیاں جاری رہیں۔ تقریباً تمام چینلز نے تھوڑا یا زیادہ صورتحال کو نشر کیا۔ سینکڑوں تصاویر اور ویڈیوز سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کی گئیں مگر الیکشن کمیشن گونگا بہرا بنا رہا اور پھر یکا یک ایم کیو ایم کی جیت کا اعلان کر دیا گیا۔

پی ٹی آئی نے محض ایک حلقے سے ری پولنگ اور اپنے امیدوار کی کامیابی پر قناعت کر لی۔ حالانکہ کراچی کی دہشت گرد یرغمالیوں سے آزادی کے لئے اجتماعی جدوجہد کا حصہ بننا زیادہ ضروری ہے۔اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ کراچی میں دوبارہ فوج کی نگرانی میں الیکشن کے مطالبے پر یک زبان ہوکر ڈٹا جائے اور عدالت عالیہ سے انصاف حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ بعید نہیں کہ کراچی ایک بار پھر ماضی کی طرح امن کا گہوارہ بن سکے۔ورنہ جماعت اسلامی کے سابق یوسی ناظم اور تحریک انصاف کی رہنما کا بہیمانہ قتل خود بخود یہ واضح کر رہا ہے کہ ایم کیو ایم اپنے سیاسی حریفوں کو خوفزدہ کر کے میدان سے ہٹا دینے کی قائل ہے۔

الطاف حسین کی نفرت انگیز، دہشت گردانہ اور ملک دشمن ہرزہ سرائیوں پر پورا ملک تو کیا، بیرونِ ملک پاکستانی بھی سراپا احتجاج بن گئے۔مگر میاں نواز شریف جنہوں نے 11 مئی رات نو بجے سے ہی وزیراعظم کے لہجے میں بولنا شروع کر دیا تھا اور نجانے کس رو میں بہہ کر من موہن سنگھ کو بھی تقریبِ حلف برداری میں شرکت کی دعوت دے ڈالی تھی، نجانے کیوں الطاف حسین کی اس زہریلی تقریر پر خاموش رہے۔

بہرحال اب صورتحال یہ ہے کہ تینوں صوبوں اور وفاق میں الگ الگ جماعتوں کی مخلوط حکومتیں بن رہی ہیں۔ آپس میں یہ رنگا رنگی، کھینچا تانی کا روپ دھارے گی یا باہمی تعاون سے معاملات طے ہوں گے یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ یہ وقت پاکستان پر بڑا نازک ہے۔ جہاں امریکہ کو اس علاقے سے محفوظ نکاس درکار ہے، وہیں وزیرستان میں ڈرون حملے رکوانے کے لئے امریکہ کے آگے بلند قامتی سے کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔ کے پی میں خودکش حملوں اور بلوچستان میں ٹارگٹ کلنگ کے ساتھ ساتھ علیحدگی پسندوں کی بیخ کنی ضروری ہے۔ بجلی کا بحران دور کرنے کے لئے کالا باغ ڈیم کی تعمیر پر پیش رفت ہونی چاہیے۔ کراچی کو قاتلوں سے پاک کرنے کے لئے موثر اقدامات کا انتظار ہے۔میاں نواز شریف کی حکومت کو ان سب چیلنجز کا سامنا ہے۔

لاہور ایل ڈی اے پلازہ میں لگنے والی آگ کے ذریعے میٹرو بس سروس کی تعمیر کا ریکارڈ جلا دینے کی باتیں بھی گردش کر رہی ہیں۔عوام اب باشعور ہو رہے ہیں۔اس روش پر مزید چلنا کسی بھی حکومت کے سیاسی کیریئر کے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

47 ڈگری درجہ حرارت میں 18 گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ کے عذاب سے نجات کی دعا کے ساتھ۔

طالبہ دعا

صائمہ اسما

قرآن کا معجزہ

وہ کتاب جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی کتاب نہیں لائی جاسکتی، جو زبان وادب کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور تعلیم وحکمت کے لحاظ سے بھی

۴۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی حفاظت:

قرآن کے علاوہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کی حفاظت کی کوئی گارنٹی دے سکتا ہو۔لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے جیسا کہ درج ذیل آیت میں ہے۔

''ہم نے ہی یہ ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔'' (الحجر۹)

قرآن کی حفاظت کی دوصورتیں ہیں جو دنیا کی کسی اور کتاب کو میسر نہیں۔ایک تو یہ کہ یہ کتاب کبھی معدوم نہیں ہو گی، قیامت تک انسانوں کی ہدایت کے لیے دنیا میں موجود رہے گی۔دوسرے اس میں کوئی تحریف اور تبدیلی یا کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔یہ کتاب بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ اسی حالت میں موجود ہے اور موجود رہے گی جس حالت میں یہ نازل ہوئی تھی۔

اہم بات یہ ہے کہ یہ اعزاز اور اعجاز عام کتابوں کو تو کیا، قرآن سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو بھی حاصل نہیں۔ اس لئے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہوئیں جن کا قرآن میں ذکر ہے وہ اس اصل متن اور زبان کے ساتھ کہیں موجود نہیں جس میں وہ نازل ہوئی تھیں۔ترجمہ در ترجمہ ہو کر وہ اس حالت کو پہنچی ہیں جس میں وہ اب موجود ہیں۔اہل کتاب علماء اور تاریخ نویسوں نے بڑی آزادی کے ساتھ ان میں تحریف کی ہے۔کئی چیزیں جو ان کو پسند نہ آئیں وہ نکال دی گئیں اور بہت سی آیتیں خود گھڑ گھڑ کر ان میں شامل کر دیں جن سے ان کے مذموم مقاصد پورے ہوتے تھے۔ان لوگوں نے یہ بھی کیا کہ بائیبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام و قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلام الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔

قرآن کریم وحی کے ذریعے نبی کریمؐ کو عطا کیا

گیا۔اس لیے سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ خود آپؐ کو اس پر مکمل عبور حاصل ہوتا کہ آپ اُسے جوں کا توں صحیح الفاظ کے ساتھ دوسروں تک پہنچا دیں۔اس بات کا بھی ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا کہ قرآن آپ کے قلب و ذہن میں اصل الفاظ و معانی کے ساتھ محفوظ ہو جائے۔یہ بات قرآن میں اس طرح فرمائی گئی:

''اے نبیؐ! اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔اس کو یاد کروا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔''
(القیامہ ۱۶-۱۹)

''ہم تمھیں پڑھوا دیں گے پھر تم نہیں بھولو گے، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے۔'' (اعلیٰ ۵-۶)

قرآن کا اور نبی کریمؐ کا یہ معجزہ ہے کہ وحی کے ذریعے جو آیات اور سورتیں آپ پر نازل ہوتی تھیں وہ آپ کو خود بخود ازبر ہو جاتی تھیں۔ہم لوگوں کی طرح آپؐ کو حفظ نہیں کرنی پڑتی تھیں۔۱۶۵ آیات پر مشتمل سورہ انعام ایک ہی وقت میں نازل ہوئی اور جس رات وہ نازل ہوئی اس رات آپ نے کاتبانِ وحی کو قلمبند کروا دی۔اسی طرح اور کئی طویل سورتوں کا معاملہ ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کے لیے نبی کریمؐ کے زمانے سے ہی جو طریقے اختیار کیے گئے ان میں تحفیظ قرآن کی بہت اہمیت ہے۔ چونکہ نماز ابتدا ہی سے مسلمان پر فرض تھی اور تلاوت قرآن کو نماز کا ایک ضروری جز قرار دیا گیا تھا، اس لیے نزول قرآن کے ساتھ ہی مسلمانوں میں حفظ قرآن کا سلسلہ جاری ہو گیا اور جیسے جیسے قرآن اترتا گیا مسلمان اس کو یاد بھی کرتے چلے گئے اس طرح وہ بیسیوں، پھر سینکڑوں، پھر ہزاروں، پھر لاکھوں دلوں پر نقش ہوتا چلا گیا اور کسی شیطان کے لیے اس کا امکان نہ تھا کہ اس میں ایک لفظ کا بھی ردوبدل کر سکے۔

نبی کریمؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت عمرؓ کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ قرآن کا ایک سرکاری نسخہ تیار کیا جائے اور اس مستند نسخے کو ہمیشہ کے لیے معیار قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کو جو نبی کریمؐ کے کاتب (سکرٹری) رہ چکے تھے اس کام پر مامور کیا گیا۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ ایک طرف تو

قرآن کے وہ تمام لکھے ہوئے اجزاء فراہم کر لیے جائیں جو آپؐ نے کاتبانِ وحی کو قلمبند کرائے تھے۔ دوسری طرف صحابہ کرام میں سے جس جس کے پاس پورا قرآن یا اس کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود تھا وہ ان سے لے لیا جائے۔ پھر حفاظ قرآن سے بھی مدد لی جائے۔ ان تینوں ذرائع کی متفقہ شہادت پر کامل صحت کا اطمینان کرنے کے بعد قرآن کا ایک ایک لفظ مصحف میں ثبت کیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق قرآن مجید کا ایک مستند نسخہ تیار کر کے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ہاں رکھوا دیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں جب اسلامی سلطنت کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئی تھیں، اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس معیاری نسخۂ قرآن کی نقلیں شائع کر کے تمام ممالک اسلامیہ میں بھیج دی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

آج جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ ٹھیک ٹھیک اسی مصحف صدیقی کے مطابق ہے جس کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے سرکاری اہتمام سے تمام بلاد اسلامیہ میں بھجوائی تھیں۔ اس وقت بھی دنیا میں متعدد مقامات پر قرآن کے وہ مستند نسخے موجود ہیں۔ راقم نے خود تاشقند کی لائبریری میں ایسے ہی ایک نسخے کی زیارت کی ہے۔ اب بھی قرآن کی محفوظیت کا ثبوت یہ ہے کہ اگر کوئی افریقہ کے دور دراز گاؤں میں کسی شخص سے قرآن کا نسخہ لے آئے اور انڈونیشیا کے رہنے والے کسی حافظ قرآن سے قرآن سن کر اس سے مقابلہ کرے تو اسے اس میں کسی حرف، یا زیر زبر کا کوئی فرق نہیں ملے گا۔

۵۔ غیب کی خبریں بتانا:

قرآن کا ایک معجزہ یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق، آخرت، ملائکہ، کائنات کی تخلیق، انسانی زندگی کی ابتدا، موت، عالم برزخ، یوم حشر، میزان، جنت اور دوزخ۔ اخروی زندگی کے بارے میں جو معلومات دی گئی ہیں، انسان کے پاس ان کو جاننے کا اور کوئی حتمی ذریعہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہوئیں وہ اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں۔ اس لیے انسانیت کے لیے علم کی روشنی کا ذریعہ قیامت تک کے لیے صرف قرآن مجید ہی ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

''اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اس

کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔'' (الانعام ۵۹)

یعنی علم کل کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ ماضی، حال، مستقبل کی ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کی نظر میں ہے۔ اپنے اس علم میں سے وہ جب چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔

''اور زمین و آسمان کے پوشیدہ حقائق کا علم تو اللہ ہی کو ہے اور قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے بلکہ اس سے بھی کم۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔'' (النحل ۷۷)

''البتہ جو توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔ ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن کا رحمان نے غیب سے اپنے بندوں کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے۔'' (مریم ۶۰-۶۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہی قرآن کے ذریعے اپنے بندوں کو غیب سے یہ خبر دی ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت تیار کر رکھی ہے۔ انسان کے پاس قرآن کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ایسی معلومات کا نہیں تھا یہی قرآن کا اعجاز ہے۔

''میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا کوئی علم دینے کے لیے) پسند کیا ہو تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔'' (الجن ۲۵ تا ۲۷)

ان آیات سے ہمیں اس کائنات میں فرشتوں کے وجود کا علم دیا گیا جو رب کائنات کے کارندوں کی حیثیت سے مختلف کام سرانجام دینے کے لیے مامور ہیں۔ سورۃ البقرہ آیت ۹۷ میں بتایا گیا کہ جبریل ؑ قرآن کی ایات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریمؐ کے قلب پر نازل کرنے کے لیے مقرر ہیں۔ سورہ انفطار، آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور سورۂ ق آیات ۱۷، ۱۸

میں ان فرشتوں کا ذکر ہے جو انسانوں کے اعمال نامے تیار کر رہے ہیں۔ سورہ سجدہ آیت ۱۱ اور سورۂ ق آیات ۲۱، ۲۲، ۲۳ میں اس فرشتے کا ذکر ہے جو انسان کی روح قبض کرنے پر مقرر ہے اور پھر حشر کے روز وہی فرشتہ اسے لے کر اللہ کی عدالت میں اسے پیش کر دے گا۔ سورۃ القارعہ میں آیات ۷ تا ۱۱ میں میزان کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ سب قرآن ہی کا اعجاز ہے کہ یہ تمام معلومات ہمیں اسی کے ذریعے دی جا رہی ہیں۔

۶۔ ماضی کی گزری ہوئی قوموں اور انبیاء کے حالات کا بیان:

قرآن کا ایک عظیم معجزہ یہ ہے کہ اس میں گزری ہوئی اقوام اور انبیاء کے وہ حالات بیان کئے گئے جو اس سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھے۔ قرآن میں گزشتہ قوموں کے حالات بیان کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ مخاطبین کو یہ بتایا جائے کہ جن قوموں نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا انھوں نے زمین کو ظلم اور فساد اور بدکاری اور فسق و فجور سے بھر دیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کر کے ان کو ہلاک کر دیا اور وہ عبرت کا نشان بن گئیں اور انبیاء کے پیروکاروں کو اللہ نے غلبہ عطا فرمایا۔

کئی موقعوں پر مشرکین مکہ نے اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) کے اشارے پر نبی کریمؐ کا امتحان لینے کے لیے آپ کے سامنے کچھ سوالات رکھے۔ مثال کے طور پر یہ کہ بنی اسرائیل مصر کیسے پہنچے؟ اصحاب کہف کون تھے؟ خضرؑ کا واقعہ کیا تھا؟ ذوالقرنین کون تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مقصد یہ بات کھولنا تھا کہ کیا آپؐ کے پاس کوئی غیبی ذریعہ علم ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوالات کے جواب میں نہ صرف پوری معلومات قرآن میں بیان فرمائیں بلکہ بہت سی وہ تفصیلات بھی بتائیں جن سے اہل کتاب سمیت کوئی بھی واقف نہیں تھا اور ان واقعات کو اس پیرائے میں بیان کیا کہ وہ اس وقت کے حالات پر منطبق ہو کر نصیحت اور تنبیہہ کا ذریعہ بنیں۔

جو بھی واقعات قرآن مجید میں بیان کیے گئے وہ غیب کی خبریں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے علم کی بنا پر نبی کریمؐ اور ان کے ذریعے سے سب انسانوں کو دیں۔ اور اس حقیقت کی طرف قرآن میں کئی جگہ توجہ دلائی گئی۔ مثال کے طور پر:

''اے محمدؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعے سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریم کا سرپرست کون ہو، اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔'' (آل عمران ۴۴)

سورہ ہود میں نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے محمدؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمھاری قوم۔ پس صبر کرو، انجام کار متقیوں ہی کے حق میں ہے۔'' (ہود ۴۹)

سورہ القصص میں حضرت موسیٰؑ کے واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے محمدؐ!) تم اس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو یہ فرمان شریعت عطا کیا اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے۔ بلکہ اس کے بعد (تمھارے زمانے تک) ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے۔ تم اہل مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے، مگر (اس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طور کے دامن میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو (پہلی مرتبہ) پکارا تھا، مگر یہ تمھارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں) تاکہ تم ان لوگوں کو متنبہ کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا۔'' (القصص ۴۴ تا ۴۶)

یہ قرآن کا معجزہ ہے اور حضرت محمدؐ کے اللہ کا رسول ہونے کی واضح دلیل کہ سینکڑوں ہزاروں برس پہلے گزرے ہوئے واقعات کی جو تفصیلات ایک امی کی زبان سے ادا ہو رہی تھیں ان کے علم کا کوئی ذریعہ اس کے پاس وحی کے سوا نہیں تھا اور یہی معجزہ بہت سے ان اسباب میں سے ایک تھا جن کی بنا پر رسول کریمؐ کے ہم عصر لوگ اس بات پر یقین لاتے چلے آ رہے تھے کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں، اور آپ پر وحی آتی ہے۔

اس سے پہلے تورات اور انجیل میں پہلے گزرے ہوئے انبیاء اور ان کی قوموں کے کچھ حالات درج تھے۔ تورات اور انجیل آسمانی کتابیں تھیں لیکن بعد میں بنی اسرائیل اور عیسائی علماء نے بہت سے ایسے

مضامین ان میں شامل کر دیے تھے جو انھوں نے خود لکھے تھے۔ ان میں ان کے مرتب کردہ تاریخی واقعات بھی تھے۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے انبیاء کے اپنے اقوال اور کچھ ان علماء اور تاریخ نویسوں کی اپنی تحریریں جنھیں یہ علماء اللہ کا کلام کہہ کر پیش کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تورات اور انجیل میں گزرے ہوئے انبیاء اور قوموں کے بارے میں وحی کے ذریعے سے جو کچھ نازل ہوا تھا وہ بھی اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہ سکا۔ بہت سے واقعات گم ہو گئے اور بہت سے انبیاء ہی کے حالات اور واقعات کو مسخ کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا گیا اور ان کی کردار کشی کی گئی۔

قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے تمام واقعات کو صحیح حقائق کے ساتھ پیش کیا۔ بہت سے ایسے واقعات بیان کیے جو اس سے پہلے نہ کسی کتاب میں تھے اور نہ ہی کسی اور ذریعے سے کسی کو معلوم تھے۔ مثال کے طور پر سورۃ المومن میں فرعون کے وزراء میں سے ایک شخص کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آیا تھا اور اس نے اپنا ایمان چھپا رکھا تھا۔ وہ در پردہ حضرت موسیٰؑ کی مدد کرتا رہا اور بالآخر اس نے اپنا ایمان ظاہر کر دیا۔ اس شخص کا کردار ان حالات میں بے حد اہم تھا لیکن تورات اور انجیل پر مشتمل جو بائیبل اس وقت موجود ہے اس میں اس شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح ملکہ سبا کے حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ پر ایمان لانے کا جو واقعہ قرآن میں بیان ہوا ہے وہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ حضرت سلیمانؑ کے اس اعلیٰ کردار اور تقویٰ کا ذکر ہے کہ وہ ہر موقع پر اللہ کے سامنے جھک جاتے تھے اور اس کا شکر ادا کرتے تھے۔

یہودی ربیوں اور تاریخ نویسوں نے سب سے بڑھ کر غضب یہ کیا کہ بنی اسرائیل ہی کے انبیاء کی کردار کشی کی اور ان پر گھناؤنے الزامات لگائے۔ ان کی ڈالی ہوئی گندگی قرآن نے صحیح واقعات بیان کر کے صاف کی۔ بائیبل کے باب سلاطین میں حضرت سلیمانؑ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایسا بادشاہ تھا جو معاذ اللہ احکامِ الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہو گیا تھا۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں یہودیوں نے ان پر معاذ اللہ ملکہ سبا سے زنا کرنے کا الزام تک لگا دیا اور یہ کہ اس حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بخت نصر پیدا ہوا جس نے بیت المقدس

کو تباہ کیا۔ انھوں نے حضرت سلیمانؑ پر جادو گر ہونے کا الزام بھی لگایا۔

اسی طرح یہودیوں نے اپنے جلیل القدر پیغمبر حضرت داؤدؑ پر اپنی فوج کے ایک افسر کی بیوی سے زنا کرنے اور پھر اسی افسر کو ایک جنگ میں قصداً ہلاک کروا کر اس کی بیوی سے نکاح کرنے کا صاف الزام لگایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی عورت جس نے ایک شخص کی بیوی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت داؤدؑ کے حوالے کیا تھا، حضرت سلیمانؑ کی ماں تھی۔ یہ سارا قصہ بائیبل کی کتاب سیموئل دوم (باب ۱۱، ۱۲) میں تفصیل سے درج ہے۔ قرآن کا یہ احسان ہے کہ اس نے اس ساری گندگی کو صاف کیا اور ان سارے گھناؤنے الزامات کی نفی کرتے ہوئے صحیح واقعات کو بیان کیا۔ یہ قرآن ہی کا معجزہ ہے کہ اس نے ایسے واقعات بیان کیے جو کسی کو معلوم نہ تھے۔

اسی طرح حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کرتے ہوئے بائیبل کے باب خروج میں سونے کے زیورات کا بچھڑا بنانے اور اس کی پرستش کرنے کی دعوت دینے کا سارا الزام حضرت ہارونؑ پر ڈال دیا ہے قرآن نے سورۂ طٰہٰ اور کئی دوسری سورتوں میں اس کی تردید کی اور بتایا کہ یہ کام سامری کا تھا اور حضرت ہارونؑ کے منع کرنے کے باوجود سامری نے لوگوں کو گمراہ کیا۔ بائیبل میں باب خروج میں موسیٰؑ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے اس قبطی کو جو بنی اسرائیل کے ایک شخص سے جھگڑا کر رہا تھا جان بوجھ کر جان سے مار کر ریت میں چھپا دیا۔ قرآن نے سورۂ قصص میں اس کی تردید کی اور بتایا کہ یہ قتل بالکل غیر ارادی تھا۔

قرآن حضرت ایوبؑ کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں اور پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ (الانبیاء ۸۴) لیکن بائیبل میں ان کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس میں وہ خدا کے خلاف مجسم شکایت اور اپنی قسمت کو بار بار کوستے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح حضرت آدمؑ کے قصے میں عام طور پر یہ مشہور ہو گیا ہے کہ ممنوعہ درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کرنے کے لیے شیطان نے پہلے حضرت حوا کو گمراہ کیا اور پھر انھیں حضرت آدمؑ کو ورغلانے کے لیے آلۂ کار بنایا۔ قرآن سورۃ البقرہ آیت ۳۶ اور سورۂ اعراف آیت ۲۰ میں اس کی واضح تردید کرتا ہے اور اصل حقیقت بتاتے ہوئے یہ وضاحت کرتا

ہے کہ شیطان نے بیک وقت دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوا کے بارے میں اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی رتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصہ لیا ہے۔ وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں یہ قرآن کا عورت پر عظیم احسان ہے کہ اس نے عورت کو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہ فطرتاً گناہ گار ہے اور مرد کو بھی گناہ پر آمادہ کرتی ہے۔

اسی طرح بائیبل میں یہ افسانہ گھڑا گیا ہے کہ ''خدا نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو بنایا اور ساتویں دن آرام کیا۔'' (کتاب پیدائش) یعنی چھ دن میں زمین و آسمان کو پیدا کر کے نعوذ باللہ رب کائنات تھک گیا تھا اس لیے اسے ساتویں دن آرام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قرآن اس غلطی کو اس طرح رفع کرتا ہے:

''ہم نے زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔'' (ق ۳۸)

(جاری ہے)

☆☆☆

سید ابوالاعلیٰ مودودی

رمضان کی برکات

انسانیت کے حق میں نزولِ قرآن سے بڑی خیر اور کوئی نہیں، اور یہ خیر اس ماہِ مبارک میں اتری۔ درسِ مشکوٰۃ سے انتخاب

حضرت ابو ہریرہ ♦ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم پر رمضان کا مبارک مہینہ آیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تم پر روزے فرض کیے ہیں۔ اس میں آسمان (یعنی جنت) کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور سرکش شیاطین باندھ دیے جاتے ہیں۔ اس میں اللہ کی طرف سے ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ جو اس رات کی بھلائی سے محروم رہا وہ بس محروم ہی رہ گیا۔ (احمد، نسائی)

یہ حدیث نبی ﷺ کے ان خطبات میں سے ہے جو آپ ﷺ رمضان المبارک کی آمد کے موقع پر صحابہ کرام ⍓ کو اس مبارک مہینے کی اہمیت اور برکات سے آگاہ فرمانے کیلئے دیا کرتے تھے۔ اس میں آپ ﷺ نے پہلی بات یہ بتائی کہ رمضان بڑی ہی برکت والا مہینہ ہے اور اس کے روزے امت پر فرض کیے گئے ہیں۔

برکت کا مفہوم

برکت کے اصل معنی افزائش کے ہیں۔ رمضان کے مہینے کو مبارک مہینہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے اندر بھلائیاں نشوونما پاتی ہیں اور نیکیوں کو افزونی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس برائیاں بڑھنے کے بجائے سکڑتی چلی جاتی ہیں اور ان کی ترقی رک جاتی ہے۔

ماہ رمضان کے بزرگ یا برکت ہونے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس کے دنوں، گھنٹوں یا منٹوں میں فی نفسہٖ کوئی ایسی برکت شامل ہے جو لوگوں کو خود بخود حاصل ہو جاتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ایسے مواقع پیدا کر دیتا ہے جن کی بدولت تم اس کی بے حد وحساب برکات سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اس مہینے میں ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی جتنی زیادہ عبادت کرے گا اور نیکیوں کے جتنے زیادہ کام کرے گا، وہ سب اس کیلئے زیادہ سے زیادہ روحانی ترقی کا وسیلہ بنیں گے۔ اس لیے اس مہینے کے بزرگ اور بابرکت ہونے کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر تمہارے لیے برکتیں سمیٹنے کے بے شمار مواقع فراہم کر دیئے گئے ہیں۔

رمضان میں فیاضی

حضرت عبداللہ بن عباس ♦ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب رمضان آتا تھا تو آپ ﷺ ہر اسیر کو رہا کر دیتے تھے اور ہر سائل کو کچھ نہ کچھ نہ دیتے تھے۔ (بیہقی)

رسول اللہ ﷺ کی شفقت، رحم دلی، نرمی، عطا، بخشش اور فیاضی کا جو حال عام دنوں میں تھا وہ تو تھا ہی، کہ یہ چیزیں آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ کا حصہ تھیں، لیکن رمضان المبارک میں خاص طور پر ان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ آپ ﷺ معمول سے کہیں زیادہ گہرائی سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور اللہ کے ساتھ آپ ﷺ کی محبت میں شدت آ جاتی تھی، اس لیے آپ ﷺ کی نیکیاں بھی عام دنوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑھ جاتی تھیں۔ جیسا کہ خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ عام دنوں میں فرض ادا کرنے کا جو ثواب ملتا ہے، وہ رمضان میں نفل ادا کرنے پر ملتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ رمضان کے زمانے میں بہت کثرت سے نیکیاں کرتے تھے۔ یہاں حضور ﷺ کے عمل میں دو چیزیں مثال کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ اسیروں کو رہا کرنا اور مانگنے والوں کو دینا۔

رسول اللہ ﷺ کے اس عمل کے بارے میں کہ آپ ﷺ رمضان میں ہر قیدی کو رہا کر دیتے تھے، محدثین کے درمیان بحثیں پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جرم کی پاداش میں قید ہے تو اس کو محض رمضان کے مہینے کی وجہ سے رہا کر دینا یا سزا نہ دینا کس طرح انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہو سکتا ہے؟ اس بنا پر اس قول کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔ بعض محدثین کے نزدیک اس سے مراد جنگی قیدی ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنے ذمے کا قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے ماخوذ ہوں۔

نبی ﷺ ان کی طرف سے ان کا قرض ادا کر کے ان کو آزاد کر دیتے تھے۔ اس طرح کی بعض دوسری توجیہات بھی اس قول کی گئی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اس کی ایک اور شکل بھی ہو سکتی ہے، مثلاً آج کل کے زمانے میں ایک طریقہ پیرول (parole) پر رہا کرنے کا ہے، یعنی قیدی کو قول لے کر رہا کر دینا۔ قیدی کو اس امید پر رہا کر دیا جاتا ہے کہ وہ رہائی کی مدت ختم ہونے کے بعد خود واپس آ جائے گا۔ وہ معاشرہ ایسا تھا کہ اس میں اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ جس قیدی کو رہا کیا جا

رہا ہے' وہ یہ خیال کر کے کہ اب مجھے کون پکڑتا ہے' کسی ایسی جگہ فرار ہو جائے گا' جہاں سے اس کو پکڑنا ممکن نہ رہے گا۔ وہ تو ایسے لوگ تھے کہ اگر ان سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تھا تو خود آ کر اس کا اعتراف کرتے تھے تا کہ ان کو سزا دے کر پاک کر دیا جائے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ کے مذکورہ عمل کی یہ شکل رہی ہو کہ حضور ﷺ ایسے لوگوں کو' جن کی سزا معاف نہ ہو سکتی تھی' رمضان کے زمانے میں مشروط طور پر رہا کر دیتے ہوں تا کہ وہ رمضان کا مبارک زمانہ اپنے گھروں پر گزاریں۔ واللہ اعلم بالصواب

روزہ اور قرآن

حضرت عبداللہ بن عمر ♦ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کرتے ہیں۔ روزہ کہتا ہے کہ اے رب! میں نے اس کو دن بھر کھانے (پینے) اور شہوات سے روکے رکھا' تو میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما' اور قرآن کہتا ہے کہ (اے رب!) میں نے اسے رات کو سونے سے روکے رکھا' تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما' پس دونوں کی شفاعت قبول فرمالی جائے گی۔ (بیہقی)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روزہ اور قرآن کوئی جان دار ہیں' جو کھڑے ہو کر یہ بات کہتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک روزہ دار کا روزہ رکھنا اور قرآن پڑھنے والے کا قرآن پڑھنا دراصل خود اپنے اندر ایک شفاعت رکھتا ہے۔ جب روزہ دار اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ اس بندے نے روزہ رکھا تو اس پیشی کے ساتھ ساتھ روزے کی یہ شفاعت بھی موجود ہوتی ہے کہ یہ بندہ آپ کی خاطر دن بھر بھوکا پیاسا رہا۔ یہ چھپ کر کھا پی سکتا تھا اور دوسری خواہشات بھی پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس بندے نے چونکہ آپ کی خاطر دن بھر بھوک پیاس برداشت کی ہے اور اپنی دوسری خواہشات پر بھی پابندیاں عائد کیے رکھی ہیں' اس لیے اس کے قصور معاف فرما دیجئے۔

اسی طرح ایک شخص رات کو جو قرآن مجید پڑھتا ہے' جب وہ قرآن اللہ کے حضور پیش کیا جاتا ہے کہ آج اس بندے نے اتنا قرآن پڑھا ہے تو قرآن کا وہ پیش کیا جانا ہی خود اپنے اندر ایک شفاعت رکھتا ہے' اور وہ شفاعت یہ ہے کہ اس بندے نے دن بھر کے روزے سے تھکا ماندہ ہونے کے باوجود آپ کی رضا جوئی کی خاطر رات کو (نماز میں) کھڑے ہو کر قرآن پڑھا' اس لیے اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں۔

ظاہر بات ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ قیامت کے روز مومنین صالحین کی شفاعت فرمائیں گے‘ اسی طرح خود آدمی کے اعمال بھی اس کے حق میں شفیع ہوتے ہیں۔ آدمی کے اعمال خدا کے حضور یہ شفاعت کرتے ہیں کہ یہ آدمی یہ یہ نیکیاں کر کے آیا ہے‘ اس لیے اسے بخش دیجئے اور اس سے درگزر فرمایئے۔ نبی ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق: ’’اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے حق میں روزے اور قرآن مجید کی یہ شفاعتیں قبول فرمالیتا ہے‘‘۔

دوزخ سے رہائی

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’اور یہ وہ مہینہ ہے جس کے آغاز میں رحمت ہے‘ وسط میں مغفرت ہے اور آخر میں دوزخ سے رہائی ہے‘‘ (البیہقی)۔ گویا ادھر اس مبارک مہینے کی آمد پر آپ روزہ رکھنا شروع کرتے ہیں ادھر اللہ کی رحمت آپ پر سایہ فگن ہو جاتی ہیں۔ پھر رمضان کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اللہ تعالیٰ آپ کے قصوروں سے درگزر فرمالیتا ہے اور آپ کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ اس طرح جب آپ رمضان کے آخر تک پہنچتے ہیں تو ادھر آپ آخری روزہ رکھتے ہیں‘ ادھر آپ کو دوزخ کے خطرے سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

اس آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب آخری روزے کی وجہ سے آپ کو دوزخ سے آزادی حاصل ہو گئی تو اب آپ آزاد ہیں کہ جو جی چاہے کرتے پھریں‘ اب آپ پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ بعض لوگ رمضان کے ختم ہوتے ہی وہ سب پابندیاں توڑ ڈالتے ہیں جو اس مبارک مہینے میں انہوں نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہوتی ہیں۔ بس رمضان ختم ہوا اور وہ عین عید کے دن (یعنی شوال کی پہلی ہی تاریخ کو) سینما دیکھنے چلے گئے اور پھر اس سے آگے بڑھ کر ناچ گانے کا شوق بھی کر لیا۔ پھر کہیں بیٹھ کر کچھ تھوڑا بہت جوا وغیرہ بھی کھیل لیا۔ یہ سب اگر ایک شخص نے کر ڈالا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ادھر وہ دوزخ کے خطرے سے آزاد ہوا اور ادھر اس نے پھر اس میں کودنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی بھلا آدمی جس کے دل میں ایمان کی کچھ روشنی اور خوف خدا کی کوئی رمق موجود ہو وہ یہ کھیل نہیں کھیل سکتا۔

امت کی مغفرت

ایک مقام پر حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: ’’رمضان کی آخری رات میں میری امت کی مغفرت ہو جاتی

ہے''۔امت کی مغفرت ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ ان لوگوں کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے جو نہ روزے رکھیں اور نہ دوسرے احکام کی پیروی کریں بلکہ یہ مغفرت امت کے ان لوگوں کی ہوتی ہے جو روزے رکھتے ہیں اور احکام خداوندی کی پیروی کرتے ہیں۔اس زمانے میں یہ بات قابل تصور ہی نہ تھی کہ کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی امت میں بھی ہو اور پھر روزہ نہ رکھے۔اس وقت پوری کی پوری امت روزہ رکھتی تھی۔رمضان کا سارا زمانہ خدا کی عبادت میں گزارتی تھی۔ہر طرح کی برائیوں سے بچتی تھی اور عام دنوں سے بڑھ کر نیکیاں کرتی تھی۔اس لیے یہاں اس امت کی مغفرت کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ اس سے مراد وہ لوگ کیسے ہو سکتے ہیں کہ جب رمضان آتا ہے تو ان کی بے راہ روی اور سرکشی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔روزہ رکھنا تو ایک طرف رہا الٹا برسر عام بے تکلفی سے کھاتے پیتے ہیں۔رمضان کی آخری رات کو ایسے لوگوں کی مغفرت ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے بلکہ اس رات شاید ان کیخلاف مقدمہ فوج داری (prosecution case) مکمل ہو جاتا ہوگا۔

<u>قیام اللیل اور تراویح</u>

حضرت زید بن ثابت ♦ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں کھجور کے پتوں کی چٹائی سے ایک حجرہ بنوایا۔کئی راتوں تک اس میں نماز پڑھی یہاں تک کہ بہت سے لوگ آپ ﷺ کے پیچھے جمع ہو گئے۔پھر ایک رات لوگوں نے حضور ﷺ کی آواز نہ سنی۔انہوں نے گمان کیا کہ حضور ﷺ سو گئے ہیں۔بعض نے کھنکارنا شروع کیا کہ آپ حجرے سے نکل کر ان کی طرف تشریف لے آئیں۔آنحضور ﷺ نے باہر آ کر فرمایا: مجھے تمہاری کیفیت معلوم ہے۔مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں تم پر یہ نماز فرض نہ کر دی جائے اور اگر یہ چیز تم پر فرض ہو جاتی تو تم اس کو ادا نہ کر پاتے۔اے لوگو! اس کو اپنے گھروں میں پڑھو۔آدمی کی بہترین نماز اس کے گھر کی ہے' ماسوائے فرض نمازوں کے''۔(متفق علیہ)

حضرت جابر ♦ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں نماز پڑھے تو اپنی نماز میں سے کچھ حصہ گھر کیلئے بھی رکھ لے۔اس نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس گھر میں بھلائی کر دے گا''۔(مسلم)

حضرت ابو ذر غفاری ♦ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روزہ رکھا۔آپ ﷺ نے تراویح میں ہمارے ساتھ قیام نہ کیا' یہاں تک کہ صرف سات دن رہ گئے۔ ۲۴ رمضان کی رات کو حضور ﷺ

نے ہمارے ساتھ قیام کیا' یہاں تک کہ تہائی رات گزر گئی۔ جب چھ راتیں باقی رہ گئیں تو آپ ﷺ نے پھر ہمارے ساتھ قیام نہ کیا۔ جب پانچ راتیں رہ گئیں تو حضور ﷺ نے پھر قیام فرمایا یہاں تک کہ آدھی رات گزر گئی۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کاش! آپ ﷺ اس سے زیادہ قیام فرماتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: آدمی جس وقت امام کے ساتھ نماز پڑھتا ہے یہاں تک کہ فارغ ہو جاتا ہے تو اس کیلئے ساری رات کا قیام لکھا جاتا ہے۔ جب چار راتیں باقی رہ گئیں تو آپ ﷺ نے پھر ہمارے ساتھ قیام نہ کیا۔ جب تین راتیں باقی رہ گئیں تو آپ ﷺ نے اپنے گھر والوں کو جمع کیا اور اپنی عورتوں کو اور لوگوں کو بھی جمع کیا اور ہمارے ساتھ کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر ہمیں فلاح کے فوت ہو جانے کا خطرہ ہوا (یعنی سحری کھانے سے رہ جانے کا خوف ہوا) پھر بقیہ راتوں میں قیام نہیں کیا''۔ (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

اس سے پہلے ایک روایت حضرت زید بن ثابت ♦ کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رمضان کے ابتدائی ایام میں حضور اکرم ﷺ نے تراویح پڑھی۔ اس طویل روایت میں حضرت ابو ذر غفاری ♦ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے رمضان کے پہلے ۲۴ دن ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں روایتیں دو مختلف رمضان کا ذکر کرتی ہیں۔ حضرت ابوذر ♦ جس رمضان کا ذکر کر رہے ہیں وہ بعد کا واقعہ ہے۔ اس روایت میں حضرت ابوذر ♦ نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ کاش! آپ زیادہ قیام فرماتے جس پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی امام کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور اس وقت تک ساتھ رہتا ہے جب امام سلام پھیرے' تو اس شخص کیلئے رات بھر کا قیام لکھا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عنایت اپنے بندوں پر ایسی ہے کہ رات کی نماز جماعت کے ساتھ امام کے پیچھے پڑھتے ہیں' یعنی فرض ادا کرتے ہیں تو اس کا اجر رات بھر کے قیام کے برابر لکھا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے کرم سے جتنا چاہے عطا فرما دے۔ اس کا اصول ہے کہ سزا دیتا ہے تو صرف جرم کے مطابق' اور انعام دیتا ہے تو اپنی رحمت کے مطابق یعنی آدمی کی خدمت سے کئی گنا زیادہ۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ آدھی رات تک ہم نے تمہیں نماز پڑھائی' یہی کافی ہے۔ اجر تو اللہ ساری رات کے قیام کا دے گا۔

پھر حضرت ابوذر غفاری ♦ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تین راتیں باقی رہ گئیں تو آنحضور ﷺ نے اپنے گھر والوں، بیویوں، بچوں اور دوسرے لوگوں کو جمع کیا اور تراویح کی نماز پڑھائی۔ یہاں تک کہ انہیں اندیشہ ہوا کہ ہم فلاح سے رہ جائیں گے۔ پوچھا گیا کہ فلاح کیا ہے تو حضرت ابوذر ♦ نے جواب دیا: اس سے مراد سحری کا کھانا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ راوی جس نے حضرت ابوذر ♦ سے سوال کیا کہ فلاح کیا ہے کوئی دوسرا ہے۔ حضرت ابوذر ♦ نے بتایا کہ قیام اتنا طویل ہوا کہ خدشہ ہو گیا کہ آج سحری کا کھانا مشکل ہی سے کھایا جائے گا۔

اس روایت سے یہ ثبوت بھی ملا کہ یہ پہلے رمضان کی طرح نہیں کہ جس میں آنحضور ﷺ نے تراویح کا انتظام کیا تھا تو لوگ آپ کی آواز سن کر جمع ہو گئے تھے اور اوائل رمضان میں تراویح پڑھی تھی بلکہ اس بعد کے رمضان میں آپ ﷺ نے اور لوگوں کو بھی جمع کیا اور گھر کے بال بچوں کو بھی جمع کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اس سے اس بات کا ثبوت بھی مل گیا کہ حضرت عمرؓ نے تراویح کا جو انتظام کیا تھا وہ خلاف سنت نہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے نہ صرف خود نماز پڑھی بلکہ یہ بھی ثابت ہوا کہ دیگر لوگوں کو جمع بھی کیا۔

حضور اکرم ﷺ نے باقی دن جو تراویح نہیں پڑھائی تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تراویح فرض نہیں بلکہ سنت ہے۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو جمع بھی کیا اور نہیں بھی کیا۔ لوگوں کو از خود جمع ہو جانے سے روکا بھی نہیں، تراویح پڑھائی بھی ہے اور نہیں بھی۔ اس طرح آنحضور ﷺ نے اپنے عمل سے یہ بتا دیا کہ فرض، واجب، سنت اور نفل کیا ہیں۔ تراویح نفل ہے جس پر آنحضور ﷺ نے خود عمل کیا ہے مگر اس کو لازم نہیں کیا۔

حضرت ابو ہریرہ ♦ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قیام کیلئے رغبت دلاتے تھے لیکن تاکیداً حکم نہیں دیتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ جو شخص صحیح اعتقاد کے ساتھ ثواب کی خاطر قیام رمضان کرتا ہے اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ پھر جب نبی کریم ﷺ رحلت فرما گئے تو حضرت ابوبکر صدیق ♦ کی خلافت میں بھی یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہا اور حصرت عمر ♦ کے ابتدائی زمانۂ خلافت میں بھی یہی معمول تھا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خلیفہ دوم نے اپنے دوسرے نصف دور خلافت میں نماز تراویح کو مساجد میں باجماعت ادائیگی کی شکل میں اختیار فرمایا جو آج تک مسلمانوں میں رائج ہے۔ چونکہ آنحضور ﷺ نے

اپنے ساتھ لوگوں کے جمع ہونے کو ناپسند نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے موقع پر لوگوں کو قیام کیلئے جمع بھی کیا' تو ثابت ہوا کہ حضرت عمر ♦ نے جو انتظام قیام رمضان کے سلسلے میں کیا وہ خلاف سنت نہیں ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عبدالقاری روایت کرتے ہیں کہ ایک شب حضرت عمر بن خطاب ♦ کے ساتھ مسجد میں گیا تو دیکھا کہ لوگ علیحدہ علیحدہ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں اور کچھ لوگ ایک امام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ اس وقت حضرت عمر ♦ نے فرمایا: اگر میں انہیں ایک امام کے پیچھے جمع کر دوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ پھر فیصلہ کر کے حضرت ابی بن کعب ♦ کو امام مقرر کر دیا۔ جب دوسری شب مسجد کی طرف آئے تو دیکھا اب لوگ ایک امام کی اقتدا میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر ♦ نے فرمایا: یہ کیا اچھی بدعت ہے اور جس نماز سے تم غفلت برتتے تھے یہ زیادہ بہتر ہے کہ تم قیام اللیل کرو۔ خود حضرت عمر ♦ آخر شب کے قیام کو ترجیح دیتے تھے اور لوگ اول شب کو قیام کرتے تھے۔

حضرت سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر ♦ نے حضرت ابی بن کعب ♦ اور حضرت تمیم داری ♦ کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو ۱۱ رکعت جماعت سے پڑھائیں اور امام ان سورتوں کی تلاوت کرتے تھے جن میں تقریباً سو آیات ہوتیں۔ طویل قیام کی وجہ سے ہم لاٹھیوں کے سہارے کھڑے ہوتے تھے اور مسجد سے ہماری واپسی فجر کے قریب ہوتی۔ (موطا امام مالک)

حضرت اعرج ♦ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ رمضان کے مہینے میں کفار پر لعنت کرتے تھے اور امام سورۂ بقرہ آٹھ رکعت میں پڑھتے اور اگر وہ اس سورہ کو ۱۲ رکعت میں ختم کرتے تو ہم سمجھتے کہ انہوں نے نماز میں تخفیف کی ہے۔ (مالک)

حضرت عبداللہ بن ابوبکر روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعب ♦ سے سنا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم رمضان میں قیام اللیل سے فارغ ہوتے تو خادموں سے کہتے کہ کھانا لانے میں جلدی کرو تاکہ سحری چھوٹ نہ جائے۔ ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ فجر (صبح صادق) طلوع نہ ہو جائے۔ (مالک)

نماز تراویح کے بارے میں اکثر احادیث میں قیام اللیل کا استعمال ہوا ہے جو بجائے خود اس بات کی دلیل ہے

کہ قیام کرنے والا حسب توفیق قیام کرے۔ تعداد رکعات کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پھر مندرجہ بالا تینوں احادیث میں بھی مختلف تعداد کا بیان اس معاملے میں کسی پابندی کو ظاہر نہیں کرتا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی آسانی اور رمضان المبارک میں قرآن کا دوران نماز پڑھنا اس بات کا متقاضی تھا کہ تعداد رکعات میں مناسب اضافہ کرلیا جائے تاکہ طویل قیام کیلئے لاٹھیوں کا سہارا نہ لینا پڑے۔ لہٰذا تراویح کے سلسلے میں جس قدر بھی اختلافی آرا سامنے آتی ہیں ان کی بنیاد پر کسی نص یا حکم رسالت کی نفی نہیں ہوتی۔ (افادت مودودی' درس حدیث مشکوٰۃ' باب الصلوٰۃ)

معتکف کی نیکیاں

حضرت عبداللہ بن عباس ♦ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے معتکف (اعتکاف کرنے والا) کے بارے میں فرمایا: اعتکاف کرنے والا چونکہ (اعتکاف کے زمانے میں) گناہوں سے رکا رہتا ہے' اس لیے اس کے حق میں وہ تمام نیکیاں لکھی جاتی ہیں جو اس شخص کے حق میں لکھی جاتی ہیں جو تمام نیکیوں پر عمل پیرا ہو۔ (ابن ماجہ)

اعتکاف کرنے والا اعتکاف کی وجہ سے رکا ہوا تو گناہوں سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا معاملہ اس کے ساتھ یہ ہے کہ اس کے حق میں وہ تمام نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں جو اس دوران میں وہ مسجد سے باہر ہونے کی صورت میں کرتا.....یعنی یہ بات تو نہیں لکھی جاتی کہ اگر وہ مسجد سے باہر رہتا تو یہ بدی کرتا' لیکن یہ لکھا جاتا ہے کہ اگر وہ باہر رہتا تو یہ نیکی کرتا۔

یہ خلق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا انتہائی فیاضانہ اور مربیانہ معاملہ ہے کہ گناہ تو اس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک کہ آدمی سے اس کا صدور نہ ہو جائے اور پھر جتنا گناہ صادر ہوتا ہے صرف اسی قدر لکھا جاتا ہے۔ لیکن نیکی کا معاملہ جدا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ بندۂ مومن کے حق میں وہ نیکی لکھی جاتی ہے جو اس سے صادر ہوتی ہے بلکہ وہ نیکی بھی لکھ دی جاتی ہے جس کے متعلق یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کا موقع ملنے کی صورت میں وہ اسے انجام دیتا۔ اسی طرح اگر اس کے دل میں نیکی کا ارادہ ہی آیا ہو اور وہ اسے کسی وجہ سے پورا نہ کرسکا ہو تب بھی وہ نیکی اس کے حق میں لکھ دی جاتی ہے (جبکہ محض گناہ کا ارادہ کرنے پر اس وقت تک کوئی مواخذہ نہیں ہوتا جب تک کہ اس پر عمل نہ کیا جائے)۔ یہ خاص معاملہ اللہ تعالیٰ

اپنے نیک بندوں کے ساتھ کرتا ہے' کیونکہ وہ فیاض ہے جتنا چاہے اپنی طرف سے کسی کو دے۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ نیکی کے بغیر اجر کا مستحق ٹھہرایا جانا عجیب بات ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بادشاہ اپنی خوشی سے دیتا ہے تو اس پر کسی کے اعتراض کرنے کی کیا معقول وجہ ہوسکتی ہے۔

قرآن اور لیلۃ القدر

اس مہینے میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اس سے مراد لیلۃ القدر ہے یعنی وہ رات جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔ جیسا کہ خود قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ. وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ. لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (القدر ۹۷:۱۔۳)

ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا نزول انسانیت کیلئے عظیم الشان خیر کی حیثیت رکھتا ہے اور انسان کیلئے اس سے بڑی کوئی خیر نہیں ہوسکتی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ وہ رات جس میں یہ قرآن مجید نازل ہوا ہے' ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ دوسرے لفظوں میں پوری انسانی تاریخ میں کبھی ہزار مہینوں میں بھی انسانیت کی بھلائی کیلئے وہ کام نہیں ہوا ہے' جو اس ایک رات میں ہوا ہے۔ ہزار مہینوں کے لفظ کو گنے ہوئے ہزار نہ سمجھنا چاہئے بلکہ اس سے بہت بڑی کثرت مراد ہے۔ چنانچہ اس رات میں' جو اپنی بھلائی کے لحاظ سے ہزار مہینوں سے بھی افضل ہے' جس آدمی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور اس سے لو لگائی' اس نے بہت بڑی بھلائی حاصل کر لی کیونکہ اس رات میں بندے کا اللہ کی طرف رجوع کرنا یہی معنی تو رکھتا ہے کہ اسے اس رات کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے' اور وہ یہ جانتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر یہ کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اپنا کلام نازل فرمایا۔ اس لیے جس آدمی نے اس رات میں عبادت کا اہتمام کیا' گویا اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ اس کے دل میں قرآن مجید کی صحیح قدر و قیمت کا احساس موجود ہے۔

لیلۃ القدر کی تلاش

اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ لیلۃ القدر کے متعلق یہ وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ کون سی رات ہے۔

نبی ﷺ نے جو کچھ بتایا ہے وہ بس یہ ہے کہ وہ رات رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں آتی ہے یعنی وہ رات اکیسویں ہوسکتی ہے بائیسویں نہیں، تئیسویں ہوسکتی ہے چوبیسویں نہیں، وعلیٰ ہذاالقیاس، وہ آخری عشرے کی طاق رات ہے۔ یہ فرمانے کے بعد اس بات کو بغیر تعین کے چھوڑ دیا گیا کہ وہ کون سی رات ہے۔ عام طور پر لوگ ستائیسویں رمضان کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ لیلۃ القدر ہے لیکن یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ رمضان کی ستائیسویں شب ہی لیلۃ القدر ہے۔ البتہ جو بات تعین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ فقط یہ ہے کہ وہ آخری عشرے کی کوئی طاق رات ہے۔

لیلۃ القدر کا قطعی طور پر تعین نہ کرنے میں یہ حکمت کارفرما نظر آتی ہے کہ آدمی ہر طاق رات میں اس امید پر اللہ کے حضور کھڑا ہو کر عبادت کرے کہ شاید یہی لیلۃ القدر ہو۔ لیلۃ القدر اگر اس نے پالی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس چیز کا طالب تھا وہ اسے مل گئی۔ اس کے بعد اس نے چند مزید راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاریں تو وہ اس کی نیکی میں مزید اضافے کی موجب بنیں گی۔

اس مقام پر ایک اور بات بھی ذہن نشینی رہنی چاہئے کہ چونکہ ساری دنیا میں رمضان کی تاریخیں ایک نہیں ہوتیں اور ان میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے، اس لیے یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے کہ کس آدمی کو واقعی وہ اصل رات میسر آ گئی ہے۔ اس کیلئے ایک طالب صادق کو ہر رمضان میں اسے تلاش کرنا چاہئے۔

رمضان کا جو آخری عشرہ اعتکاف کیلئے مقرر کیا گیا ہے اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اعتکاف کا ثواب آدمی کو الگ ملے اور چونکہ اعتکاف کی حالت میں اس کی تمام طاق راتیں عبادت میں گزریں گی، اس لیے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ اسے ان میں کبھی نہ کبھی وہ رات بھی لازماً مل جائے گی۔

بعض لوگ اپنی جگہ لیلۃ القدر کی تلاش کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ رات کو باہر نکل کر یہ دیکھا جائے کہ فضا میں کوئی ایسی علامت پائی جاتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ قدر کی رات ہے۔ فضا میں کوئی ایسا نور برس رہا ہے جس سے اس کا لیلۃ القدر ہونا ثابت ہو جائے لیکن دراصل یہ طرز فکر مطابق حقیقت نہیں ہے۔ بے شک یہ نور برستا ہے لیکن یہ نور تو پورے رمضان میں اور رمضان کی ہر رات میں برستا ہے، البتہ اس کیلئے وہ آنکھیں چاہئیں جو اس کو دیکھ سکیں۔ یہ نور درحقیقت آپ کی عبادت کے

اندر برستا ہے۔ یہ نور خدا کی رضا طلبی کے اندر آپ کے انہماک میں، بھلائیوں کیلئے آپ کے ذوق وشوق میں اور عبادات کیلئے آپ کے خلوص و اہتمام میں اور فی الجملہ آپ کے ایک ایک فعل میں برستا ہے۔

بڑی محرومی

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو اس رات کی بھلائی سے محروم رہا وہ بس محروم ہی رہ گیا۔ (احمد، نسائی)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اس رات میں اللہ کی عبادت کیلئے کھڑا نہیں ہوتا تو گویا اسے قرآن مجید کی اس نعمت عظمیٰ کا احساس ہی نہیں ہے جو اس رات میں اللہ تعالیٰ نے اتاری تھی۔ اگر اسے اس بات کا احساس ہوتا تو وہ ضرور رات کے وقت عبادت کیلئے کھڑا ہوتا اور شکر ادا کرتا کہ اے اللہ! یہ تیرا احسان عظیم ہے کہ تو نے مجھے قرآن جیسی نعمت عطا فرمائی ہے۔ بے شک یہ بھی تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے کھانے کیلئے روٹی اور پہننے کیلئے لباس عنایت فرمایا۔ لیکن تیرا اصل احسان عظیم مجھ پر یہ ہے کہ تو نے مجھے ہدایت دی اور دین حق کی روشنی دکھائی۔ مجھے تاریکیوں میں بھٹکنے سے بچایا اور علم حقیقت کی وہ روشن شمع عطا کی جس کی وجہ سے میں دنیا میں سیدھے راستے پر چل کر اس قابل ہوا کہ تیری خوشنودی حاصل کر سکوں۔ پس جس شخص کو اس نعمت کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا وہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کیلئے کھڑا ہوگا اور اس کی بھلائی لوٹ لے جائے گا۔ لیکن جو شخص اس رات میں ادائے شکر کیلئے خدا کے حضور کھڑا نہیں ہوا وہ اس کی بھلائی سے محروم رہ گیا اور درحقیقت ایک بہت بڑی بھلائی سے محروم رہ گیا۔

ہمیشہ کا روزہ

حضرت مسلم قرشی ♦ سے روایت ہے کہ میں نے یا کسی اور شخص نے رسول اللہ ﷺ سے **صوم دھر** (یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے) کے متعلق سوال کیا (کہ اس کا کیا حکم ہے؟)۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے بال بچوں کا بھی تم پر حق ہے۔ رمضان کے روزے رکھو اس سے ملحقہ مہینے، یعنی شوال کے (چھ دنوں کے) روزے رکھو، اور پھر ہر بدھ اور جمعرات کو بھی روزہ رکھ لیا کرو۔ اس طرح گویا تم ہمیشہ روزہ رکھنے والے شمار ہوگے۔ (ابوداؤد، ترمذی)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں چونکہ رہبانیت کا بہت زور تھا اس لیے اہل مذاہب میں راہب، سنیاسی اور جوگی وغیرہ قسم کے لوگ **صوم دھر**

کو بڑی فضیلت اور اہمیت دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ نیک آدمی وہ ہے جو **صائم الدھر** ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ سے **صوم دھر** کے متعلق بکثرت پوچھا گیا ہے اور آپ ﷺ نے لوگوں کو بکثرت اس کے متعلق احکام بتائے ہیں۔ پیش نظر حدیث کے مطابق جب آپ ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے پوچھنے والے سے فرمایا کہ تمہارے بال بچوں کا بھی تم پر حق ہے یعنی جو شخص **صائم الدھر** ہو وہ بال بچوں کے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے ایک حدیث میں تفصیل سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا اور تمہارے پاس ملاقات کیلئے آنیوالوں کا تم پر حق ہے اور صوم دہر کے ساتھ یہ حقوق تم خوش اسلوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ اس طرح گویا حضور ﷺ نے عبادات کے سلسلے میں انتہا پسندی کا راستہ بند فرما دیا اور ہر ایسے شخص کیلئے جو فرائض سے زائد عبادت کرنا چاہتا ہے ایک اعتدال کا طریقہ مقرر فرما دیا۔

صائم الدھر بن کر بیٹھ رہنا ان لوگوں کا کام ہے جنہیں دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو اور ایسا وہی لوگ کر سکتے ہیں جو گوشوں میں جا کر بیٹھ رہیں لیکن جن لوگوں کو دنیا میں خدا کی خلافت کا حق ادا کرنا ہے وہ یہاں شادی بیاہ بھی کریں گے، بال بچوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے، کاروبار اور تجارتیں اور ملازمتیں بھی کریں گے، عدالت کی کرسیوں پر بھی بیٹھیں گے اور حکومت کا کاروبار بھی چلائیں گے۔ غرض دنیا میں خلافت خداوندی کے جو کام ہیں وہ سب انہیں انجام دینے ہوں گے۔ ایسے لوگ **صائم الدھر** کیسے بن سکتے ہیں۔ پھر **صائم الدھر** بننے والے شخص کے بارے میں انسان جس بڑی سے بڑی نیکی اور اجر کی توقع کرتا ہے اس کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ ساری نیکی اور سارا اجر ایک بندۂ مومن کو اس صورت میں بھی حاصل ہو جائے گا، جب کہ وہ اپنے باقی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ رمضان کے فرض روزوں کے بعد شوال کے چھ روزے اور ہر مہینے بدھ اور جمعرات کے روزے بھی رکھ لے۔

(یہ مضمون کتابچے کی شکل میں البدر پبلی کیشنز، اُردو بازار، لاہور سے دستیاب ہے۔فون : 042-37225030)

افشاں نوید

آزمائشوں میں راہ عمل

قرآن کے مطابق اس دنیا کا انتظام خدا کی مشیت کے تحت ہوتا ہے، نہ کہ ہماری آرزوؤں پر .....البتہ اپنی حکمت عملی کا تجزیہ کرتے رہنا حق کی قوتوں کی لازمی روش رہی ہے

تاریخ کا دبستان کھلا ہے کہ جب بھی آزمائش کی سخت گھڑی آئی اور اہل ایمان نے صحیح حکمت عملی اختیار کی تو کامیابیوں اور کامرانیوں نے ان کے قدم چومے اور پھر انہوں نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والے کو بھی سلطان شہاب الدین غوری کی وہ شکست یاد ہے جو انہوں نے پرتھوی راج کے ہاتھوں 1191 میں اٹھائی اور تب اس نے دنیا کی لذتیں اپنے اوپر حرام کر لیں۔ حتیٰ کہ وہ کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے جنہیں پہنے ہوئے وہ میدان جنگ میں شکست سے دوچار ہوا تھا۔ اور جن پر جا بجا خون کے دھبے تھے۔ محض تین سال (قوموں کی زندگی میں تین سال کی اہمیت ہی کیا ہوتی ہے) کی محنت شاقہ کے بعد وہ ایک لشکر جرار تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا فرق یہ تھا کہ اب وہ لشکر ''غوریوں'' کا لشکر نہیں تھا بلکہ مجاہدین کا لشکر تھا۔ اور اب یہ جنگ بھی ملوکیت کیلئے نہیں تھی بلکہ جہاد تھا۔ اور تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا ہے کہ اس نے اپنے سے تین گنا بڑی فوج کو شکست دی۔ آج بھی ''غوری'' اور ''پرتھوی'' میزائل اسی عظیم واقعہ کی یاد دلاتے ہیں اور ''غوری'' آج بھی ''پرتھوی'' کو زیر کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ شہاب الدین غوری جیسی قیادت میسر ہو۔

اور مذکور ہے تاریخ کے صفحات میں کہ ظہیر الدین بابر نے جب رانا سانگا کے مقابلے میں ہزیمت اٹھائی تو نہ صرف انفرادی محاسبہ کیا بلکہ فوج کی بھی نئی صف بندی کی۔ نئے آلات حرب سے فوج کو مضبوط کیا اور اعلان کیا کہ ''یہ جنگ مملکت کی توسیع کیلئے نہیں ہے حصول ثواب و جہاد کی غرض سے ہے'' تب ایک بلند مقصد کو پا کر شہادت کی آرزو سے منور قلب میدان جہاد میں اترے گھمسان کا رَن پڑا اور

جذبہ جہاد سے معمور فوج جس نے قرآن ہاتھوں میں لے کر عہد کیا تھا کہ میدان جنگ سے پیٹھ نہ پھیریں گے بالآخر کامیاب و کامران لوٹے اور برصغیر میں مغلیہ دور کا آغاز ہوا۔ جنگوں کے فیصلے بظاہر تو میدان کارزار میں ہوتے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ فیصلے ان قلوب و اذہان میں ہوتے ہیں جو ایک اعلیٰ تر مقصد کیلئے جان کی بازی لگانے کا عزم لے کر میدان جنگ میں اترتے ہیں۔ وہ بھلا کب ہارتے ہیں جو اپنے مقصد سے عشق رکھتے ہیں۔ اور وہ بازی جیت کر بھی ناکام ہی رہتے ہیں جنہیں ان کی ہوائے نبض اور معاشی مفاد وادی وادی کی سیر کراتے ہیں اور ہل من مزیدان کا نعرہ مستانہ بن جاتا ہے۔

کتنی بڑی بات ہے جو سورہ النساء میں فرمائی گئی کہ ''انجام کار نہ تمہاری آرزو پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔'' (النساء124-123)

حقیقت تو یہی ہے کہ اچھے کام کے اچھے نتیجے کی توقع کی جاتی ہے اور یہ آرزوئیں فطری ہیں لیکن قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کا انتظام خدا کی مشیت کے تحت ہوتا ہے نہ کہ ہماری آرزوؤں پر موقوف ہے۔ ہمارا کام اپنے حصے کی ذمہ داری تک محدود ہے۔ کیونکہ تاریخ اسلامی کے جتنے بھی اوراق پلٹتے جائیں ایک طرف رشد و ہدایت کے سلسلے تھے اور دوسری طرف ظلم و طاغوت۔

ایسے ہی کسی موقع کیلئے ڈاکٹر نذیر احمد شہید نے فرمایا۔

''بڑوں بڑوں کا عذر ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سرو سامان اور اسباب کار فراہم نہیں لیکن وقت کا عازم و فاتح صاحب عزیمت اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اسے ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھ سے تیار کر لوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے۔ اگر ساتھ دینے والے آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو بلاتا ہوں۔ اگر انسانوں کی زبانیں گنگ ہوگئی ہیں تو پتھروں کو بولنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا ہوا درختوں کو ساتھ دوڑنا چاہیے۔

اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ اگر رکاوٹیں اور مشکلات بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اٹھیں اور راستہ صاف کریں کہ ایک صاحب عزیمت جادہ پیما ہے۔ وہ زمانہ کی مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری ہی کرائے وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے۔ زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ اس کی جنبش لب کا منتظر ہوتا ہے۔ وہ زمانے پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ یہاں کیا کیا ہے جن سے دامن بھر لوں۔ وہ یہ دیکھنے کیلئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے کہ پورا کروں۔ بلاشبہ کامیابی اہل ایمان کیلئے ہے اور ناکامی کی جو مصلحت بتائی گئی ہے وہ یہ دوست اور دشمن میں تمیز ہو سکے۔ اور ان جفاکاروں سے بھی نجات حاصل کی جائے جو اپنی صفوں میں داخل ہو چکے ہیں بلاشبہ ناکامی ایک تکلیف دہ عمل ہے اور معرکہ احد کے ذریعے جو سبق مسلمانوں کو سکھایا گیا اس میں مادی اور دنیاوی طمع کے خطرات سے آگہی اللہ کے رسول ﷺ کی حکم عدولی کے نتائج، اپنی صفوں کی چھان پھٹک اور حقیقی دشمنوں کی طرف سے چوکنا ہونا بھی شامل ہے۔

''دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو راستی کے گواہ ہوں..... کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔'' (آل عمران 140-139)

حقائق کی دنیا میں انسانی توقعات اور منصوبے شکست و ریخت کا شکار ہوتے رہتے ہیں ان ناکامیوں میں کہیں عملی کوتاہیوں کا بھی دخل ہوتا ہے اور کہیں انسانی فطرت کی عجلت پسندی بھی، ہم کاروبار دنیا کی طرح ہر عمل کا فوری نتیجہ چاہتے ہیں۔

كلا بل تحبون العاجله۔ وه تذرون الآخره (القیامۃ 21-20)

''ہرگز نہیں دراصل تم لوگ جلد حاصل ہو جانے والی چیز سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

حقیقتاً انسانی مساعی کو شرف کامیابی اللہ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے مولانا اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

''اس کی مشیت ایک ایسی ذی اختیار مخلوق کو وجود میں

لانے کی متقاضی تھی جو اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے صحیح اور غلط ہر طرح کے راستوں پر جانے کی آزادی رکھتی ہو۔'' بات تو اتنی سی ہے کہ کبھی تعصّبات قبول حق میں رکاوٹ بنتے ہیں تو کبھی معاشی مفادات، حضرت ابوبکر صدیق وحضرت علیؓ کو قبول حق میں ذرا بھی دیر نہ لگی جبکہ حضرت عمرؓ نے اس کشمکش میں 6 سال گزار دیئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے حجاب ہٹنے میں 20 برس لگ گئے۔ اس لیے بے صبری کے بجائے ہمیں اپنی سعی جاری رکھنی چاہیے ہمیں نہیں معلوم کہ کب کس کی آنکھوں کے سامنے سے حجاب ہٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ ہماری مساعی کی پذیرائی مستقبل میں کس انداز میں کرے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ درست حکمت عملی دنیاوی کامیابی کا لازمہ ہے اور اپنی حکمت عملی کا تجزیہ کرتے رہنا حق کی قوتوں کی لازمی روش رہی ہے۔ قرآن میں خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۃ التوبہ اور سورۂ احزاب میں اپنے نبیؐ کے ساتھیوں پر تنقید وتبصرہ فرمایا

''خود احتسابی کی ضرورت'' کے تحت جناب صدر الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس تحریک نے امت کے مختلف گروہوں کے افکار اور اعمال کا گہرا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ان کے اندر جو بھی کوتاہیاں محسوس کی ہیں ان کو بغیر کسی لاگ لپٹ کے صاف صاف منظر عام پر رکھ دینے میں کسی رعایت سے کام نہیں لیا، کیونکہ دعوتی اور دینی مصالح کے پیش نظر ایسا ضروری ہو گیا تھا مگر اسے اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ تنقید اور احتساب کا فریضہ بس اتنے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتا ہے اور حق بات تو یہ ہے کہ یہ ''بہت کچھ'' ہی وہ چیز ہے جسے فی الواقع اصل تنقید اور حقیقی احتساب سمجھنا چاہیے۔ اس سے مراد وہ تنقید ہے جو اپنے اوپر کی جائے اور وہ احتساب ہے جس کی خوردبینوں کا رخ خود اپنے ہی افکار اور اعمال کی طرف ہو، دوسروں کا جائزہ لینے کی واقعی ضرورت تو صرف کبھی کبھی پیش آ سکتی ہے مگر خود اپنے تنقیدی جائزے کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ اگر اس خود احتسابی کا اہتمام نہ رکھا گیا اور اس تحریک کے علم بردار خود کو اس ضرورت سے خدانخواستہ ماورا سمجھ بیٹھے تو وہ دن دور نہ ہوگا جب وہ بھی عام امت کی تاریخ دہرا رہے ہوں گے جس کا مدت سے حال یہ ہو چکا ہے

کہ کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہوئے ان کی زبان عیسائیوں، یہودیوں اور دوسری گمراہ اور معتوب قوموں پر تو برابر نفرین کرتی اور ان کے افکار و اعمال پر لعنتیں بھیجتی رہتی ہے لیکن ذرا نہیں دیکھتی کہ خود اس کا اپنا حال بھی کچھ مختلف نہیں رہ گیا ہے۔ ضرورت اور شدید ضرورت ہے کہ آج جو لوگ یہ فرض ادا کرنے اٹھے ہوں جس کے لیے یہ امت وجود میں لائی گئی ہے وہ اس خود رافضیحت دیگراں را نصیحت کی شرمناک روش سے دور رہیں ورنہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تو وہ دوسروں کی غفلتوں اور کوتاہیوں کا شکوہ کرتے ہوں گے دوسری طرف یہی عیوب خود ان کی قوت ایمان و عمل کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہوں گے.....

اس فکر و اہتمام اور احتیاطی کوشش کی کامیاب عملی تدبیر یہ ہے کہ ان وجوہ اور اسباب کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کر لی جائے جو دعوتوں کے بگاڑ اور زوال کا باعث بنتے آئے ہیں پھر ان کی صرف تشخیص اور توضیح پر اکتفا نہ کیا جائے جس طرح ایک ریسرچ اسکالر کرتا ہے بلکہ ان تنبیہوں اور عبرتوں کا ایک مرقع اور اسبابِ زوال حق کا ایک آئینہ بنا کر خود اپنے روبرو رکھ لیا جائے یہ آئینہ جب جب کبھی کسی فکری یا عملی کجی کی نشاندہی کرے تو اسی کجی سے اپنے آپ کو پاک کر لینے میں نہ ایک لمحہ ضائع کیا جائے اور نہ کسی تاویل یا مداہنت یا غفلت سے کام لیا جائے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ آئینوں میں اپنے ظاہری خط و خال کو دیکھ لینا جتنا آسان ہوتا ہے الفاظ و معنی کے اس آئینے میں اپنے اندرون کا دیکھ لینا اتنا آسان نہیں ہوتا.....

''اللہ کی رضا'' اور ''آخرت کی کامیابی'' کے الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ اخلاص اور للّٰہیت کے فقدان کے جو بھی نتائج ہوں وہ آخرت میں سامنے آئیں گے اور دنیا میں ظاہر نہ ہوں گے۔ افراد کی انفرادی حیثیتوں کی حد تک صورت واقعہ یہی ہے مگر افراد مل کر جو جماعت بناتے ہیں اسے تو ان نامبارک نتائج سے وقت کے وقت اسی دنیا میں دوچار ہونا پڑتا ہے کیونکہ یہ دنیا افراد کے لیے اگرچہ صرف دارالعمل ہے مگر جماعتوں اور تحریکوں کے لیے یہ دارالعمل بھی ہے اور دارالجزا بھی۔''

جوگ

فضا میں ایک لے ابھری..... اردگرد کی ہر چیز ساکت ہوگئی۔آواز حد درجہ پرسوز تھی.....صرف سوز ہی نہیں غم نے آنسوؤں کی نمکینی بھی جیسے سُر میں گھول دی ہو۔

آج جونہی یہ آواز سنائی دی۔

ماسی جیراں نے تندور میں روٹی لگانے کے لئے ہاتھ ڈالا تو نکالنا بھول گئیں۔

بی بی جی کرشید نے سوئی کپڑے میں ہی رہنے دی اور حد درجہ محویت سے سننے لگیں۔

بھا انور کھیتوں میں گوڈی کر رہا تھا اس نے بیلوں کی جوڑی وہیں کھڑی رہنے دی اور گم کا گم رہ گیا۔

ماسٹر جی افضال صاحب تو باقاعدہ رومال سے آنسو پونچھنے لگے۔

لڑکے بالوں نے حیرانی سے ماسٹر جی کی طرف دیکھا۔انہیں کیا ہوا۔ایک دم سب کو معاملہ سمجھ آ گیا۔

لوکر لوگل چاچا نوردین کے گانے کی آواز آ رہی ہوگی۔چند ہی لمحوں میں پہلے سب مسکرائے۔تکّہ لگ گیا تھا۔پھر سب ہی ہمہ تن گوش ہو گئے۔دور ٹاہلی کے درخت کے نیچے چاچا نوردین آنکھیں بند کیے پورے جذب کے عالم میں گا رہا تھا۔

ڈاچی والیا، موڑ مہار وے
تیری ڈاچی دے گل وچ ہار وے
ڈاچی والیا موڑ مہار وے
تیری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں
میں تاں پیر مناون چلی آں
میں تاں پیر مناون.....
میں تاں.....

چاچا نوردین سسکیوں کے ساتھ رو پڑا..... لوکو میری ہیر مجھ سے ناراض ہوگئی..... میری ہیر چلی گئی ربّا.....۔

''چاچا..... جب تو گانا گاتا ہے ناں اللہ پاک کی قسمے سماں باندھ دیتا ہے''.....شہر کی طرف سے آتے ہوئے لڑکوں کی ٹولی جو رک کر سننے لگ گئی تھی اس میں سے ایک لڑکا بولا۔

چاچے نے آنکھیں رومال سے صاف کیں .....۔

''سماں تو بیٹا جنت میں حضرت داؤد کی آواز باندھے گی جب پرندے اڑتے اڑتے تھم جائیں گے اور درختوں کے پتے تالیاں بجائیں گے.....''

''جنت کی جنت میں دیکھی جائے گی چاچا یہاں تو تمھارا ہی بول بالا ہے.....'' ایک من چلا بولا۔

''بول تو بس اوپر والی ذات کا ہی بالا ہے.....میں کیا اور میری اوقات کیا .....'' چاچا انکسار سے جواب دیتا۔

''چاچا میری منگیتر کا ماماٹی وی ریڈیو پر گاتا ہے، ایمان سے تیرا اگر اس سے ٹاکرا کرا دوں تو چاروں پاسے بہہ جا بہہ جا ہو جائے گی .....عمر میں تو تو بوڑھا ہے لیکن آواز بڑی جوان ہے.....نکھری.....نکھری..... دلوں میں اترنے والی۔''

''نہ، نہ پتر، مجھے کہیں نہیں جانا۔'' چاچا منہ چھپا کے بھاگ گیا.....

لڑکے بالے حیرانی سے اسے جاتا دیکھ رہے تھے .....''پتہ نہیں کبھی کبھی چاچا جھلا ہو جاتا ہے.....'' ایک آواز آئی۔

''پھر بھی کوئی ایسے روتا کرلاتا تھوڑا ہی ہے جیسے چاچا گیت گاتے ہوئے روتا ہے۔'' ایک اور تبصرہ سنائی دیا۔

''ضرور کوئی بات ہوئی ہے اس کے ساتھ.....'' یہ سب کے دلوں میں آنے والی مشترکہ سوچ تھی۔

☆☆☆

''نی نیک بخت دعا کر دعا، آج اللہ میری لاج رکھ لے۔'' ناظر حسین نے نئی نویلی بیوی کو نوکری پر جاتے ہوئے کہا۔

''دعا تو میں کروں گی، پر پتہ تو چلے آج کون سا ایسا اہم کام ہے جس کے لیے کبھی نماز نہ پڑھنے والے نے بھی دعا کا کہہ دیا.....''

''بس ہے ناں کام ..... میں نے منت میں داتا صاحب کی نیاز کے لیے ایک دیگ مانی ہے.....'' ناظر حسین نے آنکھوں میں چمک لاتے ہوئے کہا۔

بیوی کا منہ کڑوا ہو گیا.....اس نے کچھ بولنے کے لیے ہونٹ کھولے پھر خاموش ہو گئی ..... شادی کے دو اڑھائی ماہ میں اسے ٹھیک ٹھاک تجربہ ہو گیا تھا اپنے میاں کے مزاج کا ..... وہ کسی کی اپنے معاملات میں مداخلت پسند کرتا تھا نہ اس کی اجازت دیتا تھا۔

دروازے سے نکلتے نکلتے ناظر حسین نے پھر یاددہانی کروائی۔''بھولنا مت.....اللہ میری مراد پوری کرے جو مانگو گی بنوا کر دوں گا۔''

حرا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا.....ایک پیسے کو خرچ کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچنے والے کا دل آج کیسے اتنا کھلا ہو گیا؟

☆☆☆

''مبارکاں نیک بختے مبارکاں.....'' ناظر حسین مٹھائی کے ڈبے اور نوٹوں کے ہار کے ساتھ اندر آیا .....اس کے چہرے پر سوائے خوشی کے کسی چیز کا عکس نہ تھا.....حرا نے حیرانی سے اسے دیکھا، اتنا تو اپنی شادی والے دن بھی خوش نہیں تھا جتنا آج ہے..... بات کیا ہے؟''

''حرا جی میں پاس ہو گیا.....'' ناظر حسین نے لڈو حرا کے منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

حرا پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔''پاس ہو گئے؟ آپ نے کوئی امتحان دیا تھا جس کا نتیجہ آج آیا ہے؟''

''اوئے امتحان سا امتحان .....'' ناظر حسین نے کہا.....''زندگی کا سب سے بڑا امتحان.....''

''پہیلیاں ہی بوجھواتے رہیں گے یا بتائیں گے بھی۔''حرا نے بے تابی سے پوچھا۔

''بتاؤں گا .....ضرور بتاؤں گا .....تمھیں نہیں تو اور کس کو بتاؤں گا.....''

ناظر نے سسپنس برقرار رکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تصویر آگے کی۔ پولورائیڈ کیمرہ سے کھینچی تازہ تازہ تصویر۔

''بتاؤ یہ کون ہے؟''اس نے پھولوں کے ہار سے لدے آدمی پر انگلی رکھی یہ کون ہے؟

حرا نے ایک لمحہ دیکھنے میں لگایا اور جواب دیا.....

''آپ ہیں .....لیکن یہ تو بتائیں کس چیز میں کامیاب ہوئے ہیں؟''

''میں ریڈیو میں گانے کے لیے سلیکٹ ہو گیا ہوں۔ میرا آج جی ایم صاحب نے آڈیشن لیا تھا اس میں سو فیصد کامیاب ہوا ہوں .....اب دیکھنا قسمت کی پری مجھ پر کیسے مہربان ہو گی .....نئی گاڑی، ہزار گز کا بنگلہ، نوکر چاکر.....''شیخ چلی کے انداز میں ہاتھ پھیلا کر ناظر حسین نے کہا۔

''گانا.....آپ گانے گائیں گے؟''حرا تیز لہجے میں بولی۔

''تو اور کیا لوگ تو فرمائشیں سفارشیں کرواتے ہیں

مجھ پر تو یہ وقت آیا ہی نہیں.....سوہنے رب نے خود ہی درکھول دیا۔آج ریڈیو ہے،کل ٹی وی،فلم میں گانوں کے لیے میری ہی آواز ہوگی۔'' اس نے پر جوش ہوکر کہا۔

''آپ پہلے بھی گانے گاتے تھے؟'' حرا کو بات ہضم نہیں ہورہی تھی.....

''لوکرلوگل .....تمھیں نہیں پتہ وہ پچھلے کمرہ میں ہارمونیم باجا اور سارے موسیقی کے آلات کس کے ہیں؟''

''آپ کی آپا نے تو بتایا تھا کہ وہ مالک مکان کے ہیں اور آپ دوستوں کی شادی بیاہ میں بس گاتے ہیں۔''

''تو.....فرق کیا ہے شوق سے گا لیا یا پیسے کے لیے گا لیا.....اب تو اوڑھنا بچھونا ہی گانا ہوگا.....کوئی حسرت پوری کی ہے میری اللہ نے .....'' ناظر حسین کے چہرہ پر بس سرور ہی سرور تھا۔

''لیکن گانا بجانا تو حرام ہے.....'' اس نے دلیل دی۔

''لو.....اور سنو.....لوگوں کے دلوں کو خوش کرنا اور خوش کرنے کے لیے گانا تو عبادت ہے یہ حرام کیسے ہو گیا؟؟ حرا بی بی یہ مولویوں والے فتوے میرے کانوں میں مت ڈالو.....خوشی کا ذائقہ بھی کرکرا کر دیا .....'' ناگواری سے اس نے کہا۔

اگلی رات کو ریڈیو پر اس نے پہلی ریکارڈنگ کروائی۔ پورے اعتماد کے ساتھ۔سر، کے تو ویسے ہی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔گانے کی ریکارڈنگ نے جنگلز میں گانوں کا راستہ کھولا.....اور جنگلز کے گانوں نے مشہور ومعروف میوزیکل بینڈ والوں کے کانوں تک اس کی آواز پہنچائی.....میوزیکل بینڈ کے کامیاب شوز نے اسے ایک کامیاب گلوکار کے طور پر پیش کیا۔

یہ مراحل طے ہونے میں صرف سات سال لگے لیکن ان سات سالوں میں اس کا لائف سٹائل ہی نہیں بدلا،نظریات اور اعمال بھی بدل گئے.....دولت مسائل کا حل پیش کرتی ہے تو انسان کے اندر چھپی صلاحیتوں کا کھوج بھی لگاتی ہے۔کل کا ناظر حسین بی اے سات سالوں کے بعد ایک کامیاب بزنس مین اور سوسائٹی کا معتبر نام تھا۔

پرانا محلّہ، پرانا گھر بدلا تو پرانے دوست احباب بھی بدل گئے۔رشتہ داروں کو شکوہ ہوتا کہ عید بقرعید پر بھی نظر نہیں آتے۔

لوگ باگ کہتے تھے اس کے بغیر کوئی شو کامیاب نہیں ہوسکتا.....حرا کیا کہتی تھی؟؟

کچھ بھی نہیں!!! ناظر حسین کی ہزار گواہیوں کے باوجود وہ خاموشی کا بت تھی.....کبھی چڑ کر وہ کہتا۔

''تم ڈرتی ہو مجھ پر شوبز کا جادو چل جائے گا؟''

حرا، بھیگی پلکوں سے اسے دیکھتی اور انکار میں سر ہلا دیتی۔

''تم سمجھتی ہو تمھاری جگہ کوئی اور لے لے گی؟'' وہ سوال کرتا۔

''نہیں .....'' وہ آہستہ سے کہتی۔''آپ نہیں جانتے یہ سب حرام ہے.....اور حرام میں کشش ہوتی ہے.....اتنی کشش کہ جہنم تک لے جا کے چھوڑتی ہے .....۔''

''پلیز حرا.....'' وہ ہاتھ جوڑتا.....''میں دو ماہ کے ٹور کے بعد اپنے گھر اپنی بیوی کے پاس آیا ہوں کسی مدرسہ کی عالمہ فاضلہ کے پاس نہیں.....'' وہ کہتا۔

اور حرا یہ موضوع چھوڑ دیتی۔

''اچھا نئے گھر میں دل لگ گیا ہے ناں ..... سامنے شمسی صاحب کا گھر ہے۔ان کی مسز بہت نائس ہیں ادھر چلی جایا کرو .....کوئی گیٹ ٹو گیدر یا کلب جوائن کرلو.....اس طرح تو اکیلی بور ہو جاؤ گی.....''

''میں اپنے گھر میں بور نہیں ہوتی۔'' حرا نے مختصر جواب دیا۔ ناظر حسین نے بھی فون کی گھنٹی کی آواز پر توجہ دوسری طرف کرلی۔

☆☆☆

''سرونٹ کوارٹرز سے ماسی کو یا اس کی بیٹی کو ساتھ سلا لیا کرو۔'' ناظر حسین نے گھر سے نکلتے ہوئے حرا کو تلقین کی.....۔

''ٹھیک ہے.....'' حرا کا جواب گنے چنے الفاظ میں ہوتا۔

''میں نہ جاؤں مگر تم تو اب مجھ سے بات کرنے کی بھی روادار نہیں ہو۔'' تلخی سے اس نے بریف کیس نیچے پٹخا۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔''الگ ہونا چاہتی ہو مجھ سے؟'' اس نے فقرہ کسا۔

''نہیں ویسے ہی اکیلے رہ کے زیادہ بولنے کی عادت نہیں رہی.....'' حرا نے جواب دیا۔

''بہرحال موڈ درست رکھو۔ اتنی مدت کے بعد تمھارا یہ رویہ مجھے پسند نہیں ہے.....دھیان رکھنا.....''

''جی ٹھیک ہے.....'' حرا نے چہرہ پر مسکراہٹ لانا

چاہی لیکن آنکھ سے ٹپکے آنسو نے اس کی مسکراہٹ کا گلا گھونٹ دیا۔

☆☆☆

''ماسی انوری گیٹ پر بیل ہو رہی ہے.....'' حرا نے کام والی ماسی سے کہا جو پہلے ہی گیٹ کھولنے کے لیے قدم بڑھا چکی تھیں۔

''صاحب جی آئے ہیں.....'' ماسی نے خوشی سے بتایا۔ یہ اسے پتہ تھا صاحب جی بعد میں پہنچتے ہیں ان کے یار بیلی پہلے پہنچ جاتے ہیں۔

''آتے ہی انھیں کپڑے چینج کرنا ہوتے ہیں۔'' کہہ کر حرا تیزی سے لاکڈ بیڈروم کھولنے کے لیے آگے بڑھی.....اتنے میں ناظر حسین بھی اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

''یہ.....تم..... بیڈروم کو دن کے وقت لاک رکھتی ہو؟''

حیرانی سے اس نے پوچھا ''کیوں؟''

''وہ اکیلی ہوتی ہوں ناں .....'' حرا نے اٹک اٹک کر کہا۔

''تو بیڈروم کیوں لاک کرتی ہو.....اوہ مائی گاڈ'' اس نے حیرانی سے کہا۔''اور یہ پچھلے تین ہفتوں سے لاکڈ ہے؟؟''

حرا چپ رہی.....

''یہ دیکھو، میری ساکس یہ نیچے گر گئی تھی اور میرا آئی ڈی کارڈ اسی دراز کے اوپر پڑا ہے جہاں میں نے رکھا تھا.....'' وہ خاصا پریشان تھا۔

''آپ کے بعد میرا اس بیڈروم میں دل نہیں لگتا .....'' حرا نے کہا۔

''اوہ ..... آئی ..... سی .....'' اس کی پریشانی جھاگ کی طرح نیچے بہہ گئی۔ اب میں پوری کوشش کروں گا یہاں زیادہ رہوں.....ٹھیک ہے؟'' اس نے باوفا بیوی کی آنکھوں میں اور ہی طرح کا رنگ دیکھ کر کہا۔

حرا نے کھانے پر خوب اہتمام کیا تھا۔ ناظر حسین کی پسند کی تمام ڈشز موجود تھیں ..... ڈائننگ ٹیبل پر دونوں موجود تھے۔''تم کچھ نہیں لے رہی ہو؟'' اس نے حرا سے پوچھا۔

''میں کھچڑی لوں گی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''خیریت تو ہے پچھلی دفعہ تم نے دلیہ کھایا تھا..... کیا میری کمائی بھی حرام کی ہے جو کھانا گوارا نہیں.....''

دس سالہ ساتھ نے اتنا تو سمجھا ہی دیا تھا.....حرا غمزدہ سی ہوگئی بولی کچھ نہیں.....

''خاموشی نیم رضا، اس کا مطلب ہے تم واقعی اس لیے نہیں کھانا کھاتی ہو میرے ساتھ؟''

''اوہ میرے خدایا'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما۔''تم بی بی مولوانی.....تم کیا ہو؟'' اس کے الفاظ بے ترتیب ہو کر نکل رہے تھے.....''اور میں یہ بتا دوں کہ بیڈ روم میں نہ سونے کا راز بھی یہی ہے کہ وہ میری کمائی سے بنا سجا بیڈ روم ہے.....تم کیا کرتی ہو؟ بے وقوف عورت اس طرح زندگی نہیں گزرتی .....تم اپنا فیصلہ خود کرلو.....'' اس نے بدقت تمام کہا۔

''اور کہاں جاؤں؟ بھری دنیا میں کوئی میرا نہیں .....اور جو میرا ہے۔وہ اب اپنے رب کا ہی نہیں رہا میرا کیسے ہوگا؟'' بعد مدت اس نے جواب دیا۔

''تم ہر وقت کیوں اپنے اوپر حرام حلال کو سوار رکھتی ہو؟ کون اب اس کا دھیان رکھتا ہے؟ تم نہیں جانتیں خدا کی مخلوق کو خوش کرنا بھی تو عبادت ہے..... !!''

پھیکی سی مسکراہٹ حرا کے ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے دم توڑ گئی.....''ناظر صاحب! حلال حرام کو ہر وقت اس لیے حواسوں پر سوار رکھتی ہوں کہ حرام کا ایک لقمہ ہر طرح کی عبادت کو رب کی بارگاہ میں غیر مقبول بنا دیتا ہے.....دوسرا یہ کہ کسی گناہ کا کثرت سے عام ہو جانا گناہ کے اثرات کو کم نہیں کرتا گناہ اتنا ہی رہتا ہے.....''

''ٹھیک ہے مل کے فیصلہ کرتے ہیں، یہ تو کوئی حل نہیں، تمھارا بھی خدا کے حلال رزق اور بقول تمھارے حیادار زندگی پر پورا حق ہے.....اگر میں حرام اور بے حیائی پر ہوں تو ہمارا ساتھ کیسے نبھے گا؟''

''جیسے اب نبھ رہا ہے.....!'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''انوری کالونی کی بیگمات سے کپڑے سینے کے لیے لاتی ہے جو میں رازداری سے اسی سٹور میں رکھی مشین پر سیتی ہوں.....اب اللہ کا شکر ہے اتنی آمدن ہو جاتی ہے کہ میں اپنا کھانا پانی کا بندوبست کر ہی لیتی ہوں .....میرا بستر بھی اسی سٹور میں ہے، ہاں جب آپ آ جاتے ہیں پھر ظاہر ہے یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ ناراض نہ ہوں.....میں آپ کے لیے دعا تو کرتی ہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ میرا اللہ توبہ اور ہدایت کی طلبی کی دعا کبھی رد نہیں کرتا.....بندے کی توبہ اور ہدایت کی

طرف پلٹنے کے لیے متوجہ ہی رہتا ہے۔''

ناظر حسین نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ چند لمحے قبل جسے وہ بے وقوف، ناسمجھ اور جھلی کہہ رہا تھا وہ تو وقت کی بہت بڑی ولیہ تھی .....اسے اپنا دل اتھل پتھل ہوتا محسوس ہوا.....وہ ایک میٹرک پاس عام سی لڑکی اتنی بڑی کیسے ہوگئی کہ اس کو اس کے مقابلہ میں اپنا وجود ذرے سے بھی ہلکا محسوس ہو رہا تھا..... یہ چاروں طرف روشنی ہی روشنی، نور کی کرنیں اس کی وجہ سے تو نہیں..... پتہ نہیں ناظر حسین کو کیا ہوا؟؟؟

کیا اس کے امام مسجد باپ کی تربیت سامنے آ گئی؟ یا اس کی متقی پرہیزگار تہجد گزار ماں کی دعا عرشوں تک پہنچ گئی..... یا..... یا.....اس کی حرم سرا میں موجود اس کی اہلیہ کی حق حلال کے لیے استقامت رب کے ہاں مقرب اور مقبول ٹھہری..... کہ ناظر حسین کو اپنا آپ عرش سے فرش میں بلکہ پاتال میں گرتا محسوس ہوا .....

وہ ایک منٹ کے بیسویں حصے میں حرا کے قدموں میں بیٹھ گیا..... وہ مرد تھا.....ٹھیک ہے اس نے حرام کمایا یہ بھی درست ہے اس کا حلقہ احباب خدا کو ناراض کرنے والا تھا لیکن اچھی صحبت، دعا اور حلال کمائی کی پکی کھچڑی کے ایک چمچ یا نیکی کے حسن سے مرعوبیت نے اسے بچوں کی طرح زار و قطار رونے پر مجبور کر دیا۔

وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔

☆☆☆

شہر کا مشہور معروف میوزیکل بینڈ، ناظر حسین کی طویل عدم موجودگی سے غیر معروف ہو گیا.....اس کے کیے کنٹریکٹس خود بخود منسوخ ہو گئے۔ اس کی کوٹھی اب ایک سکول کے لیے وقف ہو چکی تھی .....اور وہ میاں بیوی کہاں گئے اس کے بارے میں سب لاعلم تھے۔ لکھنے والوں نے لکھا لیکن اس خود غرض دنیا میں کون کس کو یاد رکھتا ہے؟؟

آج مرے کل دوسرا دن.....!!

ناظر حسین، اس کی آواز اور اس کا فن سب قصہ پارینہ بن گئے۔

☆☆☆

پنجاب کے ایک قدیم گاؤں میں ناظر حسین، داڑھی اور اونچی شلوار کے ساتھ چاچا نور دین کے نام سے داخل ہوا۔ لنگڑاتا ہوا! اور حرا.....وہ تو راستے میں ہی ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیاری ہو گئی ..... جب وہ بار بار ناظر حسین کا ہاتھ چوم کر اظہار تشکر کر رہی تھی۔

جنت مکانی حرا کی جب بھی چاچے نوردین کے دل میں یاد آتی وہ دور جنگلوں میں پرسوز لے میں گاتا کہیں نکل جاتا .....اور سننے والے اس دردبھری لے کے سحر میں گم صم ہوجاتے۔

جنگل میں جاتے ہی ابوبن ادھم کی پلاؤ زردے سے میزبانی اسی تخت وتاج کو ٹھکرا کر چلے آنے پر ہی تو ہوئی تھی جو ناظر حسین نے ٹھکرایا۔

دور سے چاچے نوردین کی آواز ابھی بھی مدھم مدھم لے میں سنائی دے رہی تھی۔

ڈاچی والیا موڑ مہار وے
میری ڈاچی دے گل وچ ہار وے
میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں
میں تاں پیر مناون چلی آں
میں تاں پیر مناون.....

ڈاکٹرام کلثوم

ایک یادگار تقریب

بستی کے ہر فرد کی زبان پر چودھری خیر دین کے پوتے کی پیدائش پر ہونے والی دعوت کا تذکرہ تھا۔ دعوت اپنی مثال آپ تھی۔ اس روز بستی کے ہر گھر میں یہ پیغام بھجوا دیا گیا تھا کہ کسی کو اپنے گھر کھانا پکانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہر گھر کا ہر فرد کھانا چودھری صاحب کے ہاں کھائے گا۔ بلکہ گھر لے جانا چاہے تو جتنا چاہے لے جائے۔

دعوت والے دن پوری بستی میں عید کا سماں تھا۔ کہیں بکرے ذبح ہو رہے تھے۔ کہیں دیگیں چڑھائی جا رہی تھیں، کہیں بڑے بڑے کڑاہوں میں دیسی گھی میں حلوہ تیار ہو رہا تھا۔ ایک طرف تنور دہک رہے تھے۔ ایک بڑے کمرے میں چٹائیوں پر تیار شدہ حلوہ ڈالا جا رہا تھا اور اس کا ایک پہاڑ سا بن گیا تھا۔

دن چڑھے لوگوں نے آنا شروع کیا۔ حویلی کے صحن اور کمرے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ وہیں بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے اور کچھ اپنے ساتھ لائے ہوئے برتنوں میں حسب منشا بھر کے لے جا رہے تھے۔ جو خود نہیں آ سکے تھے ان کے گھروں تک پہنچانے کا انتظام تھا۔ چودھری صاحب نے اپنے ملازمین کو ہدایت دے رکھی تھی کہ آج بستی کا کوئی فرد دعوت میں شرکت سے محروم نہ رہنے پائے۔

اردگرد کے ڈیروں اور چھوٹے دیہاتوں سے بھی لوگ پہنچے ہوئے تھے۔ صاحب مرتبہ مدعوئین کے لئے نشست کا علیحدہ بندوبست تھا۔ جہاں ان کی شایان شان ضیافت کا انتظام تھا۔ رات گئے تک بستی میں چہل پہل رہی۔ دعوت کا چرچا کئی روز تک رہا۔ دعوت کے بارے میں رطب للسان افراد میں سے کچھ کو اپنی محرومیاں پہلے سے بڑھ کر محسوس ہونے لگیں۔ جب کہ سرکردہ افراد چودھری خیر دین سے بڑھ کر کچھ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔

قاضی صاحب کی بے چینی اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ بیٹے کی شادی کا دن قریب آ رہا تھا۔ وہ ابھی تک کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پائے تھے۔ وہ بھی اس تقریب کو ایک منفرد تقریب بنانا چاہتے تھے۔ ایسی تقریب جو انہیں

اوران کے گھر والوں کواللہ رب العزت کی رضا سے قریب تر کر دینے کا سبب بن جائے۔ چودھری خیر دین نے خلقِ خدا کو کھانا کھلا کر نیکی کمائی اور تقریب کو یادگار بنا دیا۔ مگر قاضی صاحب اس سے کہیں بڑھ کر کرنا چاہتے تھے۔ کوئی ایسا انداز جو اس سے کہیں بڑھ کر یادگار رہے۔

اس رات بھی ان کے قلبی اضطراب نے انہیں زیادہ دیر بستر پر نہ رہنے دیا۔ وہ اٹھے اور اپنے مہربان رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ اپنے رب ہی سے رہنمائی کے طلب گار تھے۔ پُر حضور و پُر سرور مناجات نے بارگاہ ایزدی میں رسائی پائی اور اضطراب دل کو اطمینان وسکون نصیب ہو گیا۔ وہ ایک نتیجہ پر پہنچ چکے تھے۔

صبح ہوتے ہی انہوں نے بستی کے سرکردہ افراد کو مدعو کیا۔ وہ علاقہ کے ہر دلعزیز قاضی تھے۔ لوگ ان کی رائے اور فیصلوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مسلم، غیر مسلم سب ہی ان کے عادلانہ طرزِ عمل کے گواہ تھے۔

''آج آپ کو زحمت اس لئے دی ہے کہ میرے پیارے بیٹے کی شادی کی تاریخ نزدیک آ گئی ہے۔ مجھے آپ حضرات کا مشورہ اور تعاون درکار ہے۔'' انہوں نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ایک معزز مہمان نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کیا۔ ''ہم ہر طرح کی خدمت اور تعاون کے لئے حاضر ہیں۔ آپ گھر بیٹھے بھی حکم فرما دیتے تو کوتاہی نہ پاتے۔ حکم فرمائیے۔''

قاضی صاحب گویا ہوئے ''محترم بھائیو! آپ کے اس اعتماد کی بنیاد پر میں نے آپ حضرات کو یہاں آنے کی تکلیف دی۔ میرے پاس وسائل کی کمی نہیں۔ اللہ کے فضل وکرم سے میں اپنے بیٹے کی شادی کے ولیمہ میں بستی کے ہر فرد کو کھانا کھلا سکتا ہوں۔ میں شادی کی تقریبات کئی روز جاری رکھ سکتا ہوں۔ میں دلہن اور گھر کے دیگر افراد کیلئے قیمتی ملبوسات اور زیورات تیار کروا سکتا ہوں۔ لیکن میں سوچتا ہوں، اتنا خرچ کر کے کیا حاصل ہوگا؟ ہزاروں افراد انواع واقسام کے کھانے کھالیں گے۔ رنگ برنگ ملبوسات کی بہار ہوگی۔ دھوم دھام سے منعقد ہونے والی اس تقریب کا کچھ روز چرچا ہوگا اور بس!! میں چاہتا ہوں، یہ ایسی منفرد تقریب ہو جو ہمیشہ یاد رکھی جائے۔ اس ضمن میں مجھے آپ کا مشورہ درکار ہے۔''

لوگ ابھی تک بات کی تہہ کو نہ پہنچ پائے تھے، کسی

کے پاس کوئی ایسی تجویز نہیں تھی جو اس تقریب کو تاابد یادگار بنادے۔ قاضی صاحب کا متفکر چہرہ بتا رہا تھا وہ ابھی گہرے غور وخوض میں ہیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد فرمانے لگے۔

''میری خواہش ہے شادی کی تقریب پر اٹھنے والے اخراجات کسی ایسی مد میں خرچ کیے جائیں جس سے علاقہ کی کوئی اہم ضرورت پوری ہو اور ہر فرد اس سے مستفید ہو۔ بعد میں آنے والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھاتی رہیں تا کہ یہ خدمت نہ صرف میرے اور میرے خاندان کے لئے بلکہ اس فیصلہ میں شریک آپ سب کے لئے صدقہ جاریہ بن جائے۔ حتی کہ یوم الحساب کو یہ سرمایہ بڑھا چڑھا کر ہمیں لوٹایا جائے۔''

بات واضح ہوئی تو مختلف تجاویز پیش کی جانے لگیں۔

''ایک مستقل سرمایہ مختص کر دیا جائے جس سے کم حیثیت خاندانوں کے بچوں کی شادیوں میں معاونت ہو سکے، بستی کے مدرسے کو رقم دے دی جائے، شادی پر اٹھنے والے متوقع اخراجات کی رقم غربا و مساکین میں تقسیم کر دی جائے۔''

قاضی صاحب کے ذہن میں کوئی اور ہی بات تھی۔ وہ سب تجاویز غور سے سن رہے تھے۔ آخر میں کہنے لگے۔

''ہم اپنی بستی میں میٹھے پانی کی کمیابی کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ زیرِ زمین پانی کھاری ہے، پینے کے لئے پانی دور دراز واقع پہاڑی چشموں سے لانا پڑتا ہے یا وہ جو بارشوں کے دوران روک کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ کوئی ایسا بندوبست ہو جائے کہ پینے کے لئے صحت بخش پانی بستی کے اندر ہی سے حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میٹھے اور کڑوے پانی کے دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے ہماری اس بستی کے لئے بھی رب کریم نے زیرِ زمین میٹھے پانی کا ذخیرہ ضرور رکھا ہوگا۔ اس ضمن میں ہم سب مل کر کوشش کریں تو ہمارا کریم رب ضرور رہنمائی فرمائے گا۔''

حاضرین کو رائے پسند آئی۔ ایک جانب سے کسی نے اس خدشہ کا بھی دبے لفظوں میں اظہار کیا کہ دور دور تک زیرِ زمین پانی کھاری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سارا سرمایہ اور محنت رائیگاں جائے۔ تاہم قاضی صاحب کے عزم مصمم سے ظاہر ہوتا تھا انہیں اپنے رب کی جانب سے کوئی رہنمائی مل چکی ہے جس نے انہیں اس درجہ شرح صدر نصیب کیا ہے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ شادی کی تقریب تو نہایت سادگی سے منعقد ہوگی۔ حتیٰ کہ دلہن کے لئے عروسی جوڑا بھی کسی سے عاریتاً لے لیا جائے گا۔ تقریب کے لئے مختص رقم پانی کی فراہمی پر خرچ کی جائے گی۔ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو مطلوبہ مقصد کے حصول کے لئے ضروری تفصیلات طے کرنے اوران پر عمل درآمد کروانے کی ذمہ دار ہوگی۔

قاضی صاحب اپنے رب کے حضور مسلسل مناجات اوراستخارہ میں مصروف تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ کون سے مقام پر کھدائی ہو کہ نیچے سے پینے کے قابل پانی حاصل ہو سکے۔ اشارہ غیبی ہوااور قاضی صاحب نے اللہ کا نام لے کر بستی کے کنارے پر واقع ایک مقام پر کھدائی شروع کروادی۔ لوگ حیرت اورخوشی سے اس کا رِخیر میں بڑھ چڑھ کر شریک تھے۔ کھدائی گہری ہوچکی تھی، یکا یک ایک سخت چٹان نے راستہ روک لیا۔ پرعزم جوانوں کے بازوؤں کی قوت اورکدالوں کی ضرب اس چٹان کے سامنے بے بس دکھائی دینے لگے۔ قاضی صاحب صورتحال پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہیں اللہ کے وعدہ اور نصرت کا یقین تھا۔ کھدائی کے مقام کے قریب وہ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوگئے۔ رب کریم کے سامنے عاجزانہ آہ وزاری کے بعد کنوئیں میں اترے۔ زیرزمین سخت چٹان پر دوبارہ نفل ادا کرنے لگے۔ طویل دعاؤں کے بعد انہوں نے کدال ہاتھ میں لی اور ضرب لگانے لگے۔ مہربان رب کی رحمت جوش میں آئی اور چند ضربوں کے بعد سنگلاخ چٹان میں شگاف پیدا ہوگیا۔ چٹان کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ اس کے ٹوٹتے ہی ٹھنڈا میٹھا پانی ابل پڑا۔

کنوئیں سے پانی نکالنے کے لئے رہٹ کا انتظام ہوا۔ رہٹ کے بیلوں کے چارے اور فاضل پانی کو ٹھکانے لگانے کے لئے ملحقہ زمین خرید لی گئی۔ ایک چھوٹا سا گھر رہٹ چلانے والے کے لئے تعمیر ہوا۔

اس کنوئیں کا پانی لذت اور ٹھنڈک میں بے مثال تھا۔ بستی کے لوگ کہیں باہر بھی جاتے تو ایک آدھ گھڑا بھر کر ساتھ رکھتے۔ یہ پانی انہیں آبِ شفا معلوم ہوتا۔ ملحق زمین پر اگنے والی سبزیاں تازگی اورلذت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ سبزیوں کی کاشت اورفروخت کا ذمہ دار وہی مزارع تھا جو رہٹ چلانے پر مامور تھا۔ سبزیوں کی فروخت سے ہونے والی آمدنی قناعت پسند مزارع، رہٹ اور بیل کے لئے کافی ہوجاتی۔

یہ کنواں آج بھی بستی کو صحت بخش پانی فراہم

کر رہا ہے۔ رب کریم کی رحمت سے توقع ہے قاضی صاحب اسی کا فیض عالم بالا میں پا رہے ہوں گے۔ دنیا میں اس کا ایک نفع انہیں صالح اولاد کی صورت میں ملا۔ ان کی اولاد میں کئی افراد علم حقیقی سے آراستہ ہو کر اہل جہاں کے لئے منارہ نور ثابت ہوئے اور یہ فیض آج بھی جاری ہے۔

(للہ ضلع جہلم کا ایک حقیقی واقعہ)

☆☆☆

حمیرا خالد

بہار آئے گی

''میں نے کہا نا..... میں اس کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی۔''

''بالکل نہیں .....'' اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں شازو! ایسا کیا ہو گیا۔'' مریم نے پیار سے شازو کو گلے لگاتے ہوئے تھپکی دی۔

''ابھی تو تمھاری زندگی کا یہ سفر شروع ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور پھر تم نے خود ہی تو فیصلہ کیا تھا نا .....اسے لائف پارٹنر بنانے کا تو اب کیا ہوا.....؟''

مریم کے لیے واقعی یہ صورت حال انتہائی غیر متوقع تھی۔ شازو اس کی کلاس فیلو ہی نہ تھی بلکہ بہنوں سے بڑھ کر..... اسے یوں دکھی دیکھ کر اس کا دل پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا۔

''چلو بھئی لان میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں تم نے بھی کیا درد بھری کہانی چھیڑ دی۔'' اس نے بہلاتے ہوئے شازو کو باہر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور خادمہ کو چائے کا کہہ کر اس کے ساتھ ہی ہری ہری گھاس پہ بیٹھ گئی۔ رنگ برنگے پھول قطار در قطار عجب بہار دکھا رہے تھے۔ قریب ہی کرسمس کا درخت اپنی خوبصورت ساخت اور دراز قد کے ساتھ اپنی شان دکھا رہا تھا۔ قدرت کے ان مناظر میں کہانیاں بکھری دکھائی دیتی ہیں۔ انسانوں کی طرح یہ پھول اور پودے اگر ایک دوسرے سے تقابل کرنے لگیں تو شاید ان سب کی خوبصورتی اور شادابی ماند ہی پڑ جائے۔

ملازمہ نے چائے کی ٹرے سامنے رکھتے ہوئے انھیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا ورنہ دونوں ہی خیالوں ہی خیالوں میں دور تک نکل چکی تھیں۔ مریم نے شازو کو دیکھا جو شاید ابھی تک اپنی ازدواجی زندگی کی تلخیوں کے کرب میں مبتلا تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سارا منظر گھوم گیا۔ جب شازیہ اور اکبر دونوں نے کئی سال ساتھ ساتھ تعلیمی ادارے میں گزارے۔ ہر ہر انداز سے دونوں نے ایک دوسرے کو خوب جانچا اور پرکھا تھا۔ اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک دوسرے

کے لائف پارٹنر بن کر وہ بہترین زندگی گزار سکتے ہیں۔

اکبر کی والدہ اگرچہ بیٹے کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھیں مگر مصلحتاً خاموش تھیں۔ ساری زندگی بچوں کی پرورش کی مشقت اٹھانے والے بوڑھے ہاتھ اس دن کے خواب سجائے جیتے ہیں کہ اپنے بڑھاپے کو جوانی میں بدل دینے والی اعلیٰ خاندان کی بہو لائیں گے۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ کام دانشمندی اور عمر کا تجربہ مانگتا ہے ورنہ نوجوان ذہن نہ تو دور اندیش ہوتا ہے نہ ہی جذبات میں ٹھہراؤ رکھتا ہے۔ سطحی جوش و جذبہ سے ایسے کام کر گزرنا اکثر پچھتاوے کا ہی باعث بنتا ہے۔

اکبر کی والدہ بہت رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں گھر کی عزت کی خاطر کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ بیٹے نے اپنی خوشی کو مقدم رکھا تو یوں ہی سہی اور رشتہ دے دیا۔

شازیہ کی والدہ نے بھی کوئی پس و پیش نہ کی۔ آسانی سے رشتہ ہاتھ آیا تو اسے غنیمت جانا۔ رات گئی بات گئی۔ شازیہ دلہن بن کر اکبر کے گھر میں آ گئی۔ حسب روایت خوب آؤ بھگت ہوئی۔ آہستہ آہستہ مہمان رخصت ہو گئے۔ شازیہ نے محسوس کیا کہ سسرال والے اس سے کچھ کھنچے کھنچے سے ہیں۔ میل جول میں نہ کوئی اپنائیت ہے نہ جذباتیت۔

اسے ایسا لگتا کہ جیسے وہ ان کے گھر میں unwanted شے ہو۔ شاید اس لیے کہ اس کے حصول میں انھیں کوئی دشواری نہ اٹھانا پڑی تھی۔ نہ تو دروازے کھٹکھٹائے نہ جوتیاں گھسائیں۔ وہ تو پکے آم کی طرح ان کی جھولی میں آ پڑی تھی۔

اکبر کی والدہ کم گو اور بڑی متحمل مزاج خاتون تھیں۔ ان سے بات کرنے کے لیے اسے دس بار سوچنا پڑتا کہ تہذیب اور ادب کے خلاف کوئی بات نہ ہو جائے۔ لہٰذا وہ ان سے پرے پرے ہی رہا کرتی۔

نکاح کے دو بول بولتے ہی اکبر کی شخصیت بھی اب کچھ ویسی نہ رہی تھی جیسے زمانہ طالب علمی میں وہ صدقے قربان تھے۔ اب تو اکبر کو اس سے بات کرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔

کاروباری زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے وہ کہا کرتے تم خود مصروف ہو جاؤ گی تو دیکھنا، تمھیں شکایت نہیں رہے گی۔ اور اسے مصروف کرنے کے لیے ان کے پاس بے شمار کام تھے۔

''ڈیئر! جلدی نکلنا ہے کپڑے پریس کروا دو پلیز .....''

''شاید دیر سے گھر آؤں، اچھا سا ناشتہ بنا دو اور

ہاں بجلی اور فون کے بلوں کی آخری تاریخ ہے۔ یہ کام ضرور کر لینا۔''

اور.....اور..... وہ سوچتی رہ جاتی۔ لائف پارٹنر سے اسے بس یہی کچھ چاہیے تھا؟ اسے یوں لگتا کہ گھر کے ملازموں میں وہ بھی ایک ملازمہ ہے جس کا نام شازیہ اکبر ہے۔

اکبر کی بے حسی پر وہ تنہائی میں آنسو بہانے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ شاید اس کا کہنا درست تھا۔''ساری باتیں تو کر لیں شازو کالج لائف میں .....اب کیا کہنا چاہتی ہو۔'' وہ اکتاہٹ سے کروٹ لیتے اور ذرا دیر میں خراٹوں کی آواز کے ساتھ گہری نیند سو رہے ہوتے۔

سارا دن کے انتظار کے بعد جب شام کو اس نے اصرار کیا کہ باہر کہیں ڈنر کرنے چلتے ہیں تو کیا سپاٹ جواب دیا تھا۔

''ماما کے ہاتھ کے کھانے کی بات ہی کیا ہے۔ شازو برا نہ منانا۔ تمھارے ساتھ شہر کے سارے ریسٹورنٹس کے چکر تو لگا چکے ہیں۔ کئی سال خوب عیاشی کروائی ہے ..... اب تو دل بھر جانا چاہیے تمھارا بھی .....''

خاندان میں کسی تقریب میں جانا ہو، اس کے ساتھ سب کا رویہ ایسی غیریت کا ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو بالکل اجنبی سمجھ رہی ہوتی۔ خاندان کی لڑکیاں الگ چبھتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی ہوتیں۔ گویا اس نے ان کے حق پر ڈاکا ڈالا ہو۔ اس سے تو رسمی سی بات چیت ہوتی۔ البتہ ساری گرم جوشی اکبر کے ساتھ ہوتی کہ وہ تو غیر خاندان سے ہے۔ اس کا ہونا نہ ہونا ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

شازیہ جس اذیت سے گزر رہی تھی، مریم اچھی طرح جان رہی تھی۔ عورت اپنے شوہر کی بدصورتی یا غربت پر تو صبر کر سکتی ہے لیکن اس کی سرد مہری کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس نے اپنے آپ سے حقائق جاننے کی کوشش کی۔ کیا شازو کا انتخاب صحیح نہیں تھا؟ یا خاندان؟ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔ اس کے دل نے انصاف سے فیصلہ دیا۔ اکبر اعلیٰ کردار اور عمدہ شخصیت کا مالک تھا۔ خاندانی اعتبار سے بھی انتہائی معزز گھرانے کا تھا..... پھر کیا اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کی سزا اس ٹھنڈی جنگ کی طرح زندگی بھر بھگتنا ہوتی ہے؟ ضمیر نے سرگوشی کر کے حقیقت سمجھا دی تھی۔ عزت کا راستہ ہاتھ

سے چھوٹ جائے تو.....اس کا بھگتان یونہی بھگتنا ہوتا ہے۔

اُسے آپا بی کا خوش باش گھرانہ یاد آیا۔ آپا بی تو اپنی حیثیت سے کم گھرانہ میں بیاہ کر گئی تھیں۔

اکبر کے مقابلے میں ان کے میاں امجد بھائی تو زیادہ پڑھے لکھے اور خوش شکل بھی نہ تھے۔ اور پھر بھرے پرے وسیع خاندان کے چشم و چراغ.....لیکن کس چاہت سے ان کے والدین آپا بی کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آپا بی کو پانا ان کے خاندان کی عزت افزائی ہے۔

اور آپا بی کے مقدر کی روشنی ان ہی سے تھی۔ بڑی بہو ہی نہیں گھر کی ملکہ کا تاج حقیقت میں ان کے سر پر سجا دیا گیا۔ دیور، نندیں ان کو بھابی جان، بھابی جان کہتے نہیں تھکتے تھے۔ زمانے کے دستور میں ساس، سسر اور بہو کا رشتہ شاکی ہی ہوا کرتا ہے لیکن آپا بی کا معاملہ تو بالکل ہی الٹ تھا۔ ساس اماں بہو کو گھر سونپ کر ایسی مطمئن اور شاد تھیں کہ اب آپا بی نے جو کہا وہ گویا پتھر پر لکیر ہو گیا۔

مریم کے ذہن میں اچانک خیال آیا..... اپنی سہیلی کی زندگی سنوارنے کا حل! وہ مخاطب ہوئی۔

''شازو تم آپا بی بن جاؤ.....''

''آپا بی.....'' شازو نے ذرا اچنبھے سے پوچھا۔

''ہاں ہاں میں بتاتی ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھاری ساری محرومیاں دور ہو جائیں گی۔''

''وہ کیسے'' اس نے بے یقینی سے مریم کو دیکھا۔

''میری سنو! قدرت کا اصول ہے کہ جو چیز تمھیں وافر چاہیے ہے اسے دوسروں میں بانٹو.....یعنی دینے سے کم نہیں ہوتا بلکہ اضافہ ہو جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''.....وہ کچھ نہ سمجھی۔

''اوہو بھئی، فرض کیا کہ تمھیں مال چاہیے تو تمھارے پاس جو اور جتنا ہے اسے دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں خرچ کر دو، تمھاری ضروریات پہلے سے بہتر خود پوری ہوتی چلی جائیں گی۔ مال روکنے سے اضافہ نہیں ہوا کرتا.....وہ تو کسی بھی وقت حادثہ کی نظر بھی ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح تمھیں محبت تو جہ عزت چاہیے ہے نا.....بس آج سے تم مقدر بھر دوسروں پر لٹانا شروع کر دو اور ہاں مصنوعی انداز سے نہیں بلکہ پورے اخلاص سے.....دوسروں کی پسند، ان کی خوشی کا جاننا، اس بات کا متلاشی رہنا کہ کب اور کیسے ان کے کام آیا جائے۔ افراد خانہ کی ضروریات

کا خیال رکھنا مگر خوشی خوشی.....''

شاز و حیران ہو کر آنکھیں پھاڑے مریم کی اس منفرد سی نصیحت پر غور کر رہی تھی۔ عجیب منطق تھی لیکن دل تسلیم کر رہا تھا۔ شاید آپا بی کی زندگی کی کامیابی اور خوشی کا راز اسی میں تھا۔ اس نے اعتراف کیا اور ایک نئے حوصلے اور جذبے کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کو نیا موڑ دینے کی ٹھان لی۔

فرحی نعیم

المیہ

''زری بیٹا، آج ذرا ڈرائنگ روم بھی اچھی طرح صاف کر لینا۔'' امی نے کچن میں روٹی بناتی ہوئی زری سے کہا۔

''امی ڈرائنگ روم تو میں نے کل ہی اچھی طرح صاف کیا تھا۔ اب کل پھر کرلوں گی۔'' زری مصروف لہجے میں بولی۔

''نہیں بیٹا، آج پھر کر لو کچھ مہمانوں نے آنا ہے۔'' امی سبزی بنا رہی تھیں وہ زری کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''اوہو امی آج کون آ رہا ہے کہیں بھائی کے دوست تو نہیں، وہی کہہ گئے ہوں گے صبح آپ کو۔' وہ روٹی بیلتے ہوئے بولی۔

''نہیں عامر کے دوست نہیں بلکہ تمھیں دیکھنے کچھ خواتین آئیں گی، بس تم کر لینا، اور بازار سے فیضی سے دو تین چیزیں بھی منگوانی ہیں یہ لڑکا آ جائے تو پھر منگواؤں۔ رضیہ آپا لا رہی ہیں چند خواتین کو بس خدا کرے بات بن جائے۔''

اور زری منہ بنا کر رہ گئی۔ پہلے ہی اتنی گرمی لگ رہی تھی اب پھر امی اپنی نگرانی میں سب صفائی کروائیں گی پھر کہیں جا کر مطمئن ہوں گی۔

☆☆☆

''زری بیٹا فارغ ہو گئیں نا۔''

''جی امی۔''

''بیٹا اب ایک نظر کچن میں بھی دیکھ لو کہ فیضی سب چیزیں لے آیا نا۔''

''اچھا امی'' پھر اس نے کچن میں دیکھا فیضی امی کی منگوائی ہوئی مطلوبہ چیزیں لے آیا تھا۔ وہ واپس کمرے میں آئی اور اپنی چھوٹی بہن حنا سے مخاطب ہوئی۔

''اب چائے تم بناؤ گی میں صبح سے لگی ہوئی بہت تھک چکی ہوں۔''

''تو مہمان بھی تو آپ کے لیے آ رہے ہیں کوئی میرے لیے تھوڑی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''اچھا تو کیا تم پھر کوئی کام نہیں کرو گی۔''

''یہ تو میں نے نہیں کہا، چلیں چائے بنا دوں گی۔''

''اور بعد میں برتن بھی دھودوں گی۔''

''اب آپ زیادہ نہ پھیلیں۔'' پھر اس کی معصوم صورت دیکھ کر بولی ''اوکے، دھودوں گی۔ بس اب تو خوش۔'' تو زری تیزی سے سر ہلانے لگی اور دونوں ہنس پڑیں۔

گھنٹی کی آواز پر امی نے درواہ کھولا اور لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر رہ گئیں۔ پھر انھوں نے جلدی سے آنے والوں کے لیے رستہ چھوڑا اور انھیں ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انھوں نے زری کو بلانے کے لیے کہا اور امی نے دوسرے کمرے میں آ کر زری سے چائے لانے کا کہا۔

''امی ..... کیا ہو گیا ہے، چھوڑیں چائے وائے اور میں بھی نہیں آ رہی۔''

''ہوں، زری وہ مہمان ہیں بس تم جلدی سے چائے لاؤ۔ حنا تم بہن کی مدد کرو۔'' امی دونوں سے کہہ کر پلٹیں لیکن زری نے انھیں پھر ٹھہرا لیا۔

''امی آپ کیوں جانتے بوجھتے یہ سب کر رہی ہیں بس انھیں چلتا کریں۔'' زری جھنجھلا کر بولی۔

''آہستہ بولو، ہمیں ان پر کچھ ظاہر نہیں کرنا تم رواج کے مطابق چائے لاؤ کچھ دیر بیٹھو پھر اٹھ جانا، جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا ہی کرو۔ ہم کیوں کسی کو اپنے خلاف کچھ کہنے کا موقع دیں۔ شاباش بس اب جلدی سے آؤ۔'' امی یہ کہہ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئیں اور زری پیر پٹختی کچن میں آ گئی۔

چائے لے کر وہ کمرے میں آئی تب بھی اس کا موڈ صحیح نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے اوپر قابو کر رکھا تھا۔ جتنی دیر مہمان چائے پیتے رہے اتنی ہی دیر اس کا جائزہ بھی لیا جاتا رہا۔ ابھی اس کا انٹرویو جاری تھا کہ وہ بہانہ بنا کر اٹھ گئی اور کمرے سے نکل کر اس نے سکھ کا سانس لیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مہمان خواتین بھی چلی گئی تھیں۔ اس نے حنا کو اشارہ کیا کہ اب وعدہ کے مطابق وہی سب سمیٹے اور برتن بھی دھو دے۔ حنا بھی اس کی موڈ کی خرابی دیکھتے ہوئے خاموشی سے اٹھ گئی تھی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد امی بھی خاموشی سے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئیں تھیں۔ انھوں نے کچھ تبصرہ نہ کیا تھا جبکہ زری کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان خواتین کے لیے

خوب باتیں سنائے۔ اگر چہ اس نے حنا کے آگے تو خوب دل کی بھڑاس نکالی تھی لیکن پھر بھی وہ جلی بھنی تھی۔ اور چند دن بعد ہی رضیہ خالہ ان کی طرف سے زری کا پیغام لے آئیں اور ساتھ ہی خوب تعریفیں لڑکے کی کرنے لگیں۔ امی خاموشی سے پہلے تو ان کے قصیدے سنتی رہیں پھر بس بولیں تو اتنا۔

''آپا میں زری کے ابو سے مشورہ کر کے ہی آپ کو جواب دوں گی۔'' امی سنجیدہ تھیں۔

''اے زاہدہ بس مشورہ کر کے ہاں ہی کر دینا لڑکا اچھا خاصا ہے۔ ٹھیک ہی کما لیتا ہے کوئی اتنی عمر بھی نہیں ہے۔ پھر اپنی زری کی عمر تو بس اب نکلی کہ جب، اور صورت شکل بھی واجبی ہے کتنے دنوں کے بعد تو کوئی ڈھنگ کا رشتہ آیا ہے تمھارے در پر، اب زیادہ دیر نہ لگانا۔'' انھوں نے تو گویا فیصلہ ہی کر لیا تھا۔

امی سر ہلا کر رہ گئیں بولنے سے انھوں نے گریز ہی کیا تھا۔ تو دوسری طرف زری جو اپنے کمرے سے ان دونوں کو نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ سن بھی رہی تھی غصہ سے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی تھی۔ رضیہ خالہ کے جانے کے بعد وہ تن فن کرتی امی کے پاس آئی تھی۔

''امی آپ نے رضیہ خالہ کو اسی وقت ہی کیوں نہ انکار کر دیا۔ یہ آپ نے ابو سے مشورہ کرنے کا..... اس کا کیا مطلب ہے۔''

''بیٹا تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟ آخر مصلحت بھی کوئی چیز ہے۔ یہ تو میں نے ابھی ان کو ٹالنے کے لیے کہا تھا۔ تمھارا کیا خیال ہے میں یا تمھارے ابو آنکھوں دیکھی مکھی نگلیں گے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے زری کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''آپ کو تو انھیں کھری کھری سنانی چاہیے تھی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی رضیہ خالہ کیسے ان کی تعریف کر رہی تھیں جیسے ہم کچھ جانتے نہیں۔''

''یہ بھی اچھا ہے کہ وہ سمجھ رہی ہیں کہ ہم انجان ہیں اور میں نے بھی یہی ظاہر کرنا ہے کہ میں اُن کے متعلق لاعلم ہوں اسی میں ہماری بھلائی ہے ورنہ بیٹا یہ گھر گھر جانے والی ہمارے متعلق کچھ الٹا سیدھا کہہ دیں تو ہم تو مفت ہی میں برے بن جائیں گے۔'' امی نے سکون سے اسے سمجھایا تو زری بھی اس مصلحت کی قائل ہوگئی وہ جو غصہ میں پیچ وتاب کھا رہی تھی وقتی طور پر کچھ نارمل ہوگئی۔

امی نے ابو سے مشورہ کر کے ایک ہفتہ بعد

لڑکے والوں کو بڑی سہولت سے انکار کہلوا بھیجا۔ رضیہ آپا تو انکار کا سنتے ہی اگلے ہی دن پھر آ پہنچی۔

''یہ کیا کیا تم نے زاہدہ؟ انکار کیوں کر دیا۔''

''بس آپا زری کے ابو کو لڑکا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' وہ آہستہ سے بولیں۔''میں نے تو کہا تھا کہ اچھی طرح دیکھ لیں اگر لڑکا مناسب معلوم ہو رہا ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن ..... اب آپ ہی بولو میں کوئی زبردستی تو نہیں کر سکتی نا۔'' وہ پرسکون لہجے میں بولیں اور ان کا غصہ بھی ٹھنڈا کیا۔ ساتھ میں چند نوٹ بھی ان کی مٹھی میں دبا دیے کہ یہ ان کی مجبوری تھی۔ نوٹوں کی گرمی محسوس کرتے ہی رضیہ خالہ کا پارہ جو اوپر چڑھا ہوا تھا یک دم ہی نقطہ انجماد کے آس پاس آ گیا اور وہ زیادہ کچھ کہہ نہ سکیں اور چائے پی کر روانہ ہو گئیں۔ امی نے ایک سمجھداری کا کام یہ بھی کیا تھا کہ ابو کو کہہ سن کر لڑکے کو دیکھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اگرچہ وہ لڑکے کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ جانتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ دیکھ آئے تھے اور آس پاس کے لوگوں سے بھی کچھ رسمی معلومات لے لی تھیں۔ اب امی کو بات بنانے میں سہولت ہو گئی تھی کہ لڑکی کے والد دیکھ گئے تھے اس کے بعد ہی انکار کیا ہے۔ اگر بغیر دیکھے انکار کرتے تو پھر شاید کوئی بات سمجھتا بھی۔ ابھی تو کام ہو گیا تھا اور ان کے لیے یہی کافی تھا۔

حنا کالج سے گھر آئی تو خالہ جان کو دیکھ کر خوش ہو گئی اور کمرے میں گھستے ہی اس نے زوردار سلام کیا اور خالہ کے گلے سے لپٹ کر شکوے کرنے لگی۔

''خالہ جان کیسی ہیں آپ کتنے دنوں کے بعد آئی ہیں کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ آپ ہم لوگوں کو بھول ہی جاتی ہیں کہ اسی شہر میں آپ کی بہن اور بھانجے بھانجیاں بھی رہتے ہیں۔'' حنا لاڈ سے کہہ رہی تھی اور وہ چھوٹی ہونے کے سبب خالہ کی چہیتی بھی تھی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو بھلا میں تم لوگوں کو بھولوں گی۔'' خالہ جان اس کے بال سنوارتے ہوئے محبت سے بولیں۔

''تو پھر آتی کیوں نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کتنے دنوں بلکہ مہینوں کے بعد آئی ہیں آپ۔'' وہ مصنوعی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

''اچھا بتاؤ کتنے دنوں کے بعد؟'' وہ مسکرائیں۔

''پورے دو مہینے اور.....'' وہ چند لمحوں کے بعد رکی ''سترہ دن''

''اوہو میری بیٹی نے تو بڑا حساب کتاب رکھا ہوا ہے۔'' وہ سچ مچ حیران ہو گئیں تھیں اور تھوڑی سی شرمندہ بھی۔

''اچھا حنا، اب یہ شکوے شکایات کا دفتر بند کرو اور جاؤ کپڑے وغیرہ بدل کر کچن میں زری کی مدد کرو اور کھانے کا سامان کرو۔''

''جی اچھا۔'' حنا کھڑے ہوتے ہوئے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

''ارے اتنی تھکی ہوئی تو آئی ہے اور تم نے فوراً کام پر لگا دیا اور میرے لیے کچھ زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں بس جو گھر میں ہے وہی اچھا ہے۔ زری بھی کب سے کچن میں گھسی ہے۔ میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں۔''

''کچھ نہیں کر رہیں آپا، آپ آرام سے بیٹھیں اور اگر میں یا بچیاں کر بھی رہے ہیں تو یہ سب آپ کی محبت میں کر رہے ہیں۔''

''ہاں سچ کہتی ہو میں تو خود تم لوگوں کے خلوص کے آگے شرمندہ ہو جاتی ہوں اب بھی کتنے دنوں سے جاوید سے کہہ رہی تھی کہ پہنچا دو، لیکن وہ خود اتنا مصروف رہتا ہے کہ کیا کرے، لیکن کل تو میں نے ارادہ کر ہی لیا تھا اور اس سے بھی کہہ دیا تھا۔ چنانچہ میرے تیور دیکھ کر وہ آج چھوڑ ہی گیا۔ اچھا زاہدہ یہ تو بتاؤ کہ زری کے لیے تم نے کیا سوچا ہوا ہے؟''

''زری کے لیے! کیا مطلب آپا۔'' زاہدہ نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''بھئی تم زری کے لیے کیسا رشتہ چاہتی ہو؟'' اب آپا نے ذرا کھل کر پوچھا تھا۔

''آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپا؟ میں سمجھ نہیں پا رہی۔ ظاہر سی بات ہے میری کوئی لمبی چوڑی شرائط تو ہیں نہیں بس نیک شریف لوگ ہوں۔ متوسط درجے کے، لڑکا مناسب کماتا بھی ہو، بس اس کے علاوہ میری یا زری کے ابو کی اور کوئی شرط نہیں۔''

''ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ میری بہن بہنوئی بلکہ سارا گھر ہی بہت سادہ اور نیک طبیعت کا مالک ہے۔ اب تو حنا بھی ماشاءاللہ شادی کے قابل ہو چکی ہے۔ کتنا فرق ہے حنا اور زری میں۔'' وہ پوچھ رہی تھیں۔

''چار سال کا۔'' زاہدہ دبی آواز میں بولیں

''ویسے آپا بات کیا ہے آخر پتہ تو چلے آپ کبھی اس طرح گفتگو تو نہیں کرتیں۔'' امی کچھ حیران تھیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو، اصل میں ابھی کوئی دس بارہ دن پہلے میری ایک جاننے والی کے ہاں رضیہ آپا ملیں تھیں۔ وہ اس کی بیٹی کو دکھانے کے لیے چند خواتین کو لائی ہوئی تھیں۔ لوگ تو مناسب ہی معلوم ہو رہے تھے۔ وہ عارفہ کی بیٹی کو پسند کر گئے تھے ان کے انداز سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا ان لوگوں کے جانے کے بعد رضیہ آپا سے میری کچھ بات چیت بھی ہوئی انھوں نے جو تفصیلات بتائیں لڑکے والوں کے بارے میں، اس پر عارفہ تو تقریباً راضی ہی لگ رہی تھی۔ اوپر تلے چار بیٹیاں ہیں اس کی بڑی پریشان رہتی ہے کہتی ہے۔ بچیوں سے نہیں، ان کے نصیب سے ڈر لگتا ہے۔ بہرحال رضیہ آپا نے باتوں کے دوران ہی بتایا کہ وہ تمھارے ہاں بھی ان لوگوں کو لائی تھی لیکن تمھاری طرف سے انکار ہو گیا۔ کچھ ناراض لگ رہی تھی کہ اچھے خاصے لوگوں کو انکار کر دیا۔ میں نے تو یہی کہا کہ بھائی جان (زری کے والد) نے جو بہتر سمجھا ہوگا وہی کیا۔ بہرحال، ظاہر ہے تم نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی انکار کیا ہوگا۔'' آپا کی سوالیہ نظریں بہن کی طرف تھیں۔

''بس آپا کیا کہوں میں آپ سے، سچ مچ اب تو لوگوں کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری سے بھی خوف آتا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمھارا؟'' وہ ناسمجھی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''بس یہ سمجھیں اللہ نے بچا لیا ورنہ میں بھی ان کی ظاہری باتوں میں آ کر شاید مان ہی جاتی۔''

''یہ کیا پہیلیاں بھجوا رہی ہو ٹھیک سے کیوں نہیں بتاتیں۔'' آپا اب الجھ سی گئیں تھیں۔

''رضیہ آپا جن خواتین کو لائی تھیں اور اپنے جس بیٹے کے لیے وہ زری کو دیکھنے آئی تھیں اس لڑکے کی شادی میں اتفاق سے میں خود شریک ہو چکی ہوں۔'' زری کی امی نے بہن کے سامنے گویا دھماکا کیا تھا۔

''ہائیں!!'' آپا تو حیرانی سے بہن کو دیکھ کر رہ گئیں، ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''جی ہاں، میرے سسرالی رشتہ دار ہیں، ہیں تو دور پرے کے لیکن خوشی غم میں ہمیشہ شریک رہتے ہیں۔ انہی کی بیٹی کی شادی تھی، ہمارا سارا گھر شریک تھا شادی میں، نہ صرف بارات بلکہ ولیمہ میں بھی

شریک تھی میں۔شادی کے صرف چند ہفتوں کے بعد ہی لڑکی پر ظلم شروع ہو گیا تھا۔ بیچاری نے نہ جانے سال بھی کیسے گزارا تھا۔ بہو نہیں بلکہ مفت کی ملازمہ بیاہ کر لائے تھے جو بغیر کھائے پیئے، بغیر کسی شکایت کے گونگی بنے صبح سے رات تک کام کرتی رہے۔ ماں کے گھر بھی بمشکل جانے دیتے تھے۔ بس کیا بتاؤں کیسی کیسی باتیں سنی ہیں میں نے لڑکی کی ماں سے، طلاق بھی خود ہی دی لڑکے نے، وہ تو جیسے تیسے گزارا کر ہی رہی تھی۔ چند ماہ کا بچہ بھی چھین لیا۔ پھر بھی چین نہیں ملا تو نہ جانے کیسی کیسی باتیں گھڑ کر اس کے متعلق مشہور کیں۔اور اب ان کی ڈھٹائی دیکھیں کس شان سے دوبارہ رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں۔لڑکی اب بھی انھیں کنواری چاہیے۔'' امی کہتے کہتے چپ کر گئیں۔ ان کا لہجہ ان کے غم کی عکاسی کر رہا تھا۔

''اس کو طلاق دیے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''کوئی آٹھ، دس ماہ تو ہو چکے ہوں گے۔''

''حد ہو گئی۔ بھلا بتاؤ تو سہی رشتہ ڈال رہے ہیں لیکن اتنی بڑی بات چھپا رہے ہیں۔ایسی باتیں بھلا کہیں چھپتی بھی ہیں۔اب یہی دیکھو تم ان کو پہچان ہی گئیں۔ میں بھی اب عارفہ کو منع کروں گی کہ فوراً ہی ان لوگوں کو انکار کہلوا دے۔تو کیا اُن لوگوں نے تم کو نہیں پہچانا اور کیا رضیہ آپا کو بھی نہیں معلوم؟''

''صد شکر آپا کہ نہ تو ان لوگوں کو اور نہ ہی رضیہ آپا کو اس بات کی خبر ہوئی اور نہ ہی میں نے ظاہر ہونے دیا۔ یہی تاثر دیا کہ میں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کسی بھی شادی میں سینکڑوں مہمان ہوتے ہیں اب وہ کس کس کو جانیں گے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو ویسے اس میں قصور لڑکے کے ساتھ گھر والوں کا بھی ہوتا ہے۔کہیں کہیں ماں بہنیں بھی بڑی شہہ دیتی ہیں اور گھر کو خراب کرنے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔'' بڑی آپا تجزیہ کر رہی تھیں۔ پھر کچھ دیر توقف کر کے گویا ہوئیں۔'' میں یہ سوچ رہی ہوں زاہدہ کہ تم نے تو انکار کر دیا اور عارفہ کو بھی میں بتاؤں گی تو وہ بھی منع کر دے گی لیکن اس کے بعد.....''

''اس کے بعد کیا آپا'' امی اس طرح ان کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں جو کسی سوچ میں چلی گئی تھیں۔

''اس کے بعد بھی یہ لوگ بیٹھیں گے تو نہیں کسی نئے گھر کی راہ لیں گی۔اور کوئی تو قسمت کا مارا انھیں

مل ہی جائے گا جو اس سارے واقعہ سے لاعلم ہوگا پھر وہ ان کی باتوں میں آ کر ہاں بھی کر دے گا۔'' بڑی آپا کہہ رہی تھیں۔

''جی ہاں ایسے مجبور اور بے بس لوگوں کی یہاں کمی تو نہیں۔'' امی نے بھی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اور پھر نہ جانے وہاں بھی حقیقت ظاہر کریں گے یا راز ہی رہنے دیں گے۔''

''لیکن آپا، وہی آپ کی بات ایسی باتیں چھپتی تو نہیں ہاں یہ ضرور کریں گے کہ خود ساختہ کہانی میں اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کر کے سارا قصور لڑکی اور اس کے گھر والوں پر ڈال دیں گے اور خود بری الذمہ ہو جائیں گے۔''

''بس ایسوں کے لیے تو ہدایت کی ہی دعا مانگی جا سکتی ہے۔ خدا ان کے دلوں کو نرم کر دے کیونکہ ایک اور لڑکی کی زندگی ان سے وابستہ ہونے جا رہی ہے اور نہ معلوم اس کے ساتھ یہ کیا سلوک کریں گے۔'' آپا کے لہجہ میں دکھ تھا۔

''آپا مجھے تو حیرت صرف ان کی ڈھٹائی پر ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ ایک لڑکی اور اس کا گھرانہ برباد کر کے دوبارہ اسی مشن پر نکل کھڑی ہوئیں۔ نہ لوگوں کی باتوں کا خوف اور نہ ہی شرمندگی و پشیمانی۔''

''ہمارا معاشرتی المیہ ہے اور کیا، لڑکے کی ماں، بہنیں ہونا ہی ان کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ بیٹی والوں کو تو پھر یہ لوگ بڑا ادنیٰ اور کمزور سمجھتے ہیں۔''

''اصل میں اس میں کچھ قصور ان والدین کا بھی ہے جو خود کو مظلوم ہی سمجھتے ہیں چونکہ لڑکی کے ماں باپ ہیں لہٰذا دب کر ہی رہنا ہے اور اسی نفسیات سے پھر لڑکے والے کھیلتے ہیں۔''

''مجبور جو ہوئے۔''

''امی، خالہ جان آ جایئے کھانا لگ گیا۔'' زری کمرے کے دروازے میں کھڑی ان دونوں کو بلا رہی تھی۔ دونوں نے ہی چونک کر اس کو دیکھا تھا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ ان دونوں کی کچھ باتیں اس کے کان میں پڑ گئی تھیں اور وہ شکر کر رہی تھی کہ اس کے والدین ان لوگوں میں شامل نہیں جہاں بیٹی کو بوجھ اور کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی بڑھتی عمر امی کے لیے پریشانی کا باعث تو تھی لیکن وہ اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں تھیں اور اس کے لیے یہی کافی تھا۔

☆☆☆

نصرت یوسف

دل کا دیا

وہ پتھر کے بیوپاری کی بیٹی تھی اور ایک مسیحا کی اولاد.....ساتھ چلتے چلتے اس کی روح زخمی ہونے لگی تھی!

وہ کیسے دشت دشت نگر نگر دل بہلانے کی کوئی کوشش کرتا، بس دیوار میں جڑی کیل کی طرح ایک ہی جگہ اپنے لئے وقف رکھی۔ایک ہی عورت تک جسے اللہ کو گواہ بنا کر لایا تھا محدود رہا۔ان پابندیوں سے چاہے اس کا بظاہر کتنا بھی استحصال ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی روش پر قائم تھا۔

شبینہ کے طرز زندگی میں دیکھا جاتا تو شادی کے بعد کبھی کوئی ایسا فرق نہیں پڑا جو سبطین کو اب اس سے گلہ محسوس ہونے لگا تھا یا وہ گلہ کرتا۔وہ تو اول دن سے ایک ہی روش پر تھی۔اپنی ذات پر ارتکاز ہمیشہ سے تھا اور اب بھی تھا۔فرق سبطین کی زندگی میں آ گیا تھا۔ دیس سے بدیس آنے کے بعد برسوں تو قدم جمانے میں لگ گئے اور جب قدم جم گئے ،زمین پیروں کے نیچے سے پختہ محسوس ہونے لگی تو احساس ہوا کہ کتنا کچھ قیمتی اردگرد سے غائب ہو چکا ہے۔جان سے پیارے رشتے ،انمول احساسات، بے لوث محبتیں کہاں ہیں؟؟ وہ بے اختیار اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا لیتا۔خاموش لکیریں خاموش ہی رہتیں،اور وہ افسردہ ہو جاتا۔

شادی کے دس سال بعد اسے شبینہ کے ساتھ کا فیصلہ کسک دینے لگا تھا اور آج دھنک رفیع کو دیکھ کر کسک جیسے رستا زخم بن گئی تھی۔ بوند بوند رستا یادوں کا مواد، اس کے اردگرد پھیل رہا تھا۔''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے؟'' وہ دھیمے سے جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوا اور مسکرایا جیسے اپنا استہزا خود اڑا رہا ہو۔

کیا فرق رہا اس میں اور مجھ میں۔وہ بھی وہاں پہنچ گئی جہاں میں ہوں، بس اسی فرق کی بنا پر تو میں نے اس کو چھوڑا تھا۔اس کی آنکھوں کی جوت سے نظریں چرائی تھیں۔اس کی ان کہی چاہت سے رخ پھیرا تھا۔ اس کی تمام خوبیوں کو نظرانداز کیا تھا۔محبت کی وہ تمام کیفیات جو اس کی بنائی تصاویر سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ان سب پر خط تنسیخ پھیر کر شبینہ نعیمی کی سنگت کو ترجیح دی تھی۔

دل سبطین عباسی کا آج خوب دہائیاں دے رہا تھا۔ حالانکہ وہ یہ بھول رہا تھا کہ دس سال قبل کی

ترجیحات میں اور آج کی ترجیحات میں نمایاں فرق اس لئے آیا ہے کہ وہ یہ عرصہ شبینہ نعیمی کے ساتھ گزار چکا ہے۔ جہاں بہرحال اس کی کامیابیوں کے پیچھے شبینہ کا ہاتھ خاصا ہے۔ان کامیابیوں کے جھنڈے تلے کھڑے ہوکر وہ دھنک رفیع کو یاد کررہا ہے جن کے گاڑنے میں شبینہ کے تعاون کو نظرانداز وہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ انسان جب نعمت پالیتا ہے تو اس کی قدر اور چاہت صفر اگر نہیں بھی ہوتی تو بالعموم خاصی دھیمی پڑجاتی ہے اور پھر وہ سوچتا ہے اگر وہ یہ انتخاب نہ بھی کرتا تو ٹھیک تھا حالانکہ فیصلے وقت ، حالات اور ضروریات بھی کراتے ہیں۔

آج سبطین دھنک کو یاد کررہا تھا جبکہ زمانہ قبل وہ اسی کو اپنے مستقبل کے حساب سے بے مصرف گردان رہا تھا۔ خیالات کی یلغار نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ وہ بھوری دو آنکھیں جو اس پر بے اختیار رکی تھیں۔ ان میں برف کوندی تھی۔محبت کا شعلہ بھی لپکا تھا جس نے سبطین عباسی کو نہ جانے کتنی دیر تک کے لئے پتھر کا بنا ڈالا تھا، اس کو بنا مخاطب کیے، ہجوم میں کہیں غائب ہوچکی تھیں۔اور وہ بس بنا حرکت کئے اس کے سحر میں گم تھا۔ دیکھ بھی نہ سکا کہ وہ کہاں گئی یہ وہ تھی بھی یا اس کا کوئی قریبی روپ، وہ ہوتی تو ایسے کیسے چلی جاتی، بنا پکارے بنا قریب آئے،ایسے کیسے دور سے دور ہوجاتی، سبطین عباسی نے آخری بات سوچتے ہوئے سوچنا بند کردیا۔

''یہ وہ تھی ہی نہیں وہ تو اس وقت گھر میں بیٹھی چائے کا مگ تھامے سیڑھیوں کی گرل کے ساتھ ٹکی ستارے دیکھ رہی ہوگی۔'' اسے برسوں قبل کی دھنک رفیع کا مشغلہ یاد آ گیا،اسکی لمبی انگلیاں چائے کے گرم مگ کے گرد لپٹی یاد آ گئیں۔مخروطی انگلیوں کے وہ لمبے خوبصورت ناخن جو کبھی انگلیوں کی پوروں سے اونچے نہیں ہوتے تھے بس ہلکی سی سفیدی ان گلابی ناخنوں کے سرے پر پہلی تاریخ کے چاند کی طرح چمکتی تھی۔اور بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنا وہ چھلا جس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے سفید زرقند چمکتے تھے۔اسے سبطین نے اس وقت تحفہ دیا تھا جب وہ مصوری کا پہلا انعام جیتی تھی۔ چاندی کا چھلا تھا جس پر سونے کا پانی چڑھا تھا۔ سبطین اس وقت بس اتنا ہی کرسکتا تھا۔ اور اخلاقی ساکھ بھی اسے اس سے زیادہ کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ نہ اس کی اور نہ دھنک کی، قیمتی ہوتا تو دس سوالات کے جوابات دھنک کو بھی اردگرد والوں کو

دینے پڑتے جن کے کوئی جوابات اس کے پاس نہ تھے۔ایسا تو وہ خود بھی لے سکتی تھی۔ یہ متاع جاں تھا تو اس لئے کہ محبت کی لہریں دھنک کو اس سے نکلتی محسوس ہوتیں۔ان لہروں کو وہ اپنے اندر گردش کرتا دیکھتی تھی، وہ سبطین کے تحفے میں بھی اسے رواں لگتیں۔

وہ اور بات کہ یہ چھلا اس نے اسی دن اتار کر بڑی حفاظت سے رکھ دیا تھا جس دن شبینہ نعیمی سبطین کے نکاح میں آ گئی تھی۔نکاح تک شاید وہ کسی معجزے کے انتظار میں تھی کہ شاید! شاید کچھ مختلف سا منظر ہو جائے ۔کہانیوں اور فلموں کی طرح۔ آخری وقت بس وہی سبطین کے سنگ زندگی گزارنے کے بونڈ پر دستخط کر رہی ہو۔جیسے خواتین کی رومانوی کہانیوں کی ہیروئن خوش قسمت ہو جاتی ہے۔

لیکن معجزے ہر ایک کے ساتھ نہیں ہوتے۔ سو اس کے ساتھ بھی نہیں ہوا اور شبینہ نعیمی نے یہ شخص جیت لیا۔''جیت'' ہی کا لفظ دھنک کے ذہن میں ابھرا تھا۔ بھلا سبطین عباسی جیسے خاص شخص کو جو پائے وہ جیتنے والا ہی تو ہوگا۔ حالانکہ سبطین عباسی ایسا بھی کوئی خاص نہ تھا جتنا اسے یا شبینہ کو لگا تھا۔ایک آدھ کو خاص لگنے والا چاہے دنیا کو خاص، شاندار یا مختلف شاید، قطعاً نہ لگے مگر جسے لگتا ہے اسے ضرور اہم ترین لگتا ہے۔ ہمارے اپنے ''لگنے'' ہی پر ہمارے فیصلوں کا بالعموم دارومدار ہوتا ہے۔تاثرات کی بنیاد ہوتا ہے۔سو دھنک رفیع نے بھی شبینہ نعیمی کو فتح یاب قرار دیا تھا۔اس نے سبطین کے ساتھ باغوں اور فواروں میں فلمی اور رومانوی قسم کے جملوں کا تبادلہ کبھی نہ کیا تھا۔ نہ ہی خصوصی لمحات گزارے تھے، جو دکھ اور صدمے سے اسکی حالت بری ہو جاتی۔حالت میں تغیر آیا تو یہ کہ اس نے محبت سے تصویریں بنانی چھوڑ دیں۔سوتے جو چاہت کے پھوٹتے تھے وہ ہی خشک سے ہو جائیں تو رنگوں سے لطافت ظاہر کرنا ممکن نہیں رہتا۔صحرا اور کانٹے، تکالیف اور زخم پینٹ کرتا اسے کبھی پسند نہ تھا۔سو اب کیا پینٹ کرے جب اس کے اپنے دل کو سیراب کرتے دریا نے رخ شبینہ نعیمی کی جانب پھیر دیا ہو۔اس نے یہ مشغلہ بھی ترک کر دیا۔ پھر تو وہ بالکل ہی عام سی ہوگئی۔ اس کے اس فیصلے نے سبطین عباسی کو اپنے فیصلہ پر مزید مطمئن کر دیا۔

''اس قدر انحصار کرنے والا نسوانی پیکر، اُف!! اس نے بے رحم تجزیہ کرتے ہوئے شبینہ کو بڑی لگاوٹ سے دیکھا تھا۔ جو رات نو بجے کسی سیمینار سے لوٹی تھی

اوراب کچن میں کھڑی مائیکرو ویو میں فروزن کھانا گرم کررہی تھی۔کافی رنگ کی لپ اسٹک اس کی کھلی ہوئی رنگت پر بچ رہی تھی۔شولڈر کٹ بالوں کواس نے کیچر میں قید کررکھا تھا۔سبطین اس کو دیکھتے ہوئے دھنک کے دبلے پتلے سراپے کوسوچ رہا تھا۔لیکن یہ سب دس برس قبل کی باتیں تھیں۔

آج اسے وہی دھنک اپنے حواسوں پر چھاتی محسوس ہورہی تھی۔ کیونکہ دس برس بعدضروریات، تاثرات اوراحساسات بدل چکے تھے۔لیکن اب فیصلہ کرنے کے لئے کوئی موقع میسر نہ تھا جسے گرفت میں وہ لے کر مطمئن ہوسکے۔ انسان کو اسی قلق سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایات ہر ہر لمحے کے لئے دی ہیں۔شادی کا فیصلہ کروتو کہا گیا''دینداری کومقدم رکھلو'' کہ نہیں پتہ تم دنیا سے فیض یاب ہو یا نہ ہولیکن اضطراب روحانی نہ رہے۔سبطین عباسی سے چوک ہوگئی تھی۔اس نے بلاشبہ دنیا خوب پالی تھی،لیکن روحانی اورقلبی طور پر وہ اسے اس سطح تک مطمئن نہ کرپائی جو سبطین کی شخصی کیمسٹری کا مطالبہ تھا، اور وقت گزرنے کے ساتھ اندورنی طور پر وہ بے چین ہوتا چلا جارہا تھا۔

شبینہ بے حد خوش اخلاق تھی، انسان دوست بھی اسے کئی مل سکتے تھے لیکن وہ اپنے میاں کی اچھی بیوی نہ تھی۔ یا شاید وہ سبطین عباسی کے لئے محبت کا دریا نہ تھی، الفت اور چاہت کا وہ بحربیکراں نہ تھی جو اسے خاموش دھنک میں محسوس ہوتا تھا۔ اطاعت وفرمانبرداری کا وہ استعارہ نہ تھی جو دھنک رفیع جیسی انحصار کرنے والی لڑکی تھی۔اطاعت اورفرمانبرداری کر ہی وہ سکتا ہے جو اپنے آپ کومحکوم سمجھے، خدا کا یا بندے کا۔شبینہ نعیمی خدا کی باغی نہ تھی لیکن محکومی کا لبادہ بھی پوری طرح نہ اوڑھی ہوئی تھی۔ بچے بھی ماں کے رنگ میں ڈھلتے جارہے تھے کہ وہاں زندگی انہیں تندوتیز لگتی تھی۔باپ کی طرح دھیمی اور پرانی نہیں۔

سبطین عباسی نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے ایک نگاہ پھر کھڑکی سے باہر نظر آتے منظر پر ڈالنی چاہی مگر نیم اندھیرے میں اسے دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کی روشنیوں کے سوا گیارہویں منزل سے کچھ نظر نہ آیا وہ بھی وقفہ وقفہ سے۔ یہ کوئی رش والا علاقہ نہ تھا جو قطاردرقطار گاڑی کی روشنیاں ہوتیں۔

اسے لگا جتنا سناٹا اس کے اپنے اندر ڈیرا ڈال چکا ہے ایسا ہی سناٹا اسکے اردگرد زمین پر بھی ہے۔بس وقفے وقفے سے خوشی کا کوئی ایک آدھ جگنو چمک اٹھتا

ہے تو وہ جی اٹھتا ہے۔ آج بھی دھنک رفیع جو یقیناً اپنے میاں کے ساتھ آئی ہوگی، دیکھ کر اسے ماضی سے کئی یادوں کے جگنو بھی ملے، تو بچھڑنے کے ملال نے اس کے وجود میں شکستگی بھر دی۔ ''اپنی تنہائی کا احساس دلاؤں کیسے۔ جو میرے دل پہ گزرتی ہے بتاؤں کیسے'' اس نے تصور میں دھنک کو مخاطب کیا اور ایک بار پھر ہونٹوں کے گوشے ذرا پھیل گئے۔ نہ جانے وہ دھنک تھی بھی یا کوئی اور، میں کہاں کہاں کی کہانیاں اس ایک جھلک سے کھود لایا۔ لیکن دھنک تھی اور اسی شہر میں تھی تو کہاں تھی؟ یہ سوال اسے مضطرب کر چکا تھا۔

اتنے میں آہٹ ہوئی۔ سبطین نے گردن ترچھی کی تو شبینہ نظر آئی۔ وہ یقیناً ڈپلیکیٹ چابی سے گھر آ چکی تھی۔ خلاف معمول وہ خاموش تھی ورنہ ان کے درمیان چند اچھے خوشگوار جملوں کا تبادلہ ضرور ہو جاتا تھا۔ ''بچے ابھی تک پیٹر کے گھر ہیں۔'' اس نے بس یہ ایک جملہ شاید اپنے آپ سے کہا تھا ورنہ وہ سبطین کے کسی تاثر کے لئے کچھ تو رکتی، سبطین نے بھی اس سے دیر سے گھر آنے کی متعلق کوئی سوال نہ کیا ویسے بھی وہ شبینہ سے کیوں، کیا، کس لئے کے سوالات کرنے کی جرات نہ رکھتا تھا۔ ہاں شبینہ کے گلے میں میرون رنگ کے کرسٹلز کی مالا کے ساتھ ایک تین پتی کے پھول کا پینڈنٹ تھا، سبطین نے آج سے قبل یہ مالا کبھی اس کے گلے میں جھولتی نہ دیکھی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے آج شبینہ مختلف لگ رہی تھی، اجنبی سی اور انجان سی، جیسے اس میں کچھ تبدیلی آ چکی ہو۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے بیڈروم کے بند دروازے کو دیکھا جہاں وہ جا چکی تھی۔ اتنا تھک کر آنے کے بعد جب وہ آرام سے فارغ ہوئی تو سبطین کچن کے سنک کے نلکوں کی خریداری کے لئے جا چکا تھا جو صحیح طور پر کام نہیں کر رہے تھے۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے قریبی میز پر رکھی شبینہ کی کتاب اٹھالی جو اس نے آنے کے بعد وہاں رکھ دی تھی اور پھر اٹھا کر کمرے میں لے جانا بھول گئی تھی۔ جینیٹکس پر کوئی کتاب تھی۔ دلچسپی سے دیکھتے ہوئے سبطین نے اس کے پیج پلٹنے شروع کر دیئے۔ خاصی اچھی کتاب تھی، ایک جگہ وہ چونک گیا۔ ایک چھوٹا سا گفٹ کارڈ رکھا تھا۔ اس نے تجسس سے کھولا، نہایت دلکش تحریر میں خوبصورت جذبے کے اظہار سے گندھا شبینہ کے نام جملہ تھا۔ حیرت تھی کہ بھیجنے والے کا نام نہیں تھا۔ لیکن بہرحال صنف مخالف ہی کی طرف سے تھا، یہ بات

طے تھی کہ ہم صنف کے تاثرات میں اس قسم کی کیفیت نہیں پائی جاتی جو اس رومانوی جملے میں تھی۔ کارڈ کے ایک طرف اسی مالا کی تصویر چھپی تھی جو آج شبینہ کو اس نے پہنے دیکھ کر حیرانی سے سوچا تھا کہ وہ گلے میں ایک باریک سی چین کے علاوہ کچھ پہننے کی عادی کبھی نہ تھی، ''آج یہ تبدیلی؟''

''تو تبدیلی کی وجہ یہ تھی۔'' اس نے زیرلب کہتے ہوئے کارڈ واپس کتاب میں رکھ کر کتاب بند کردی۔ اس نے اپنے اندر نفرت کا جوار بھاٹا شبینہ کے لئے اٹھتا محسوس کیا، بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ ٹھوکر مار کر بیڈروم کا دروازہ کھول کر شبینہ کو اپنی عدالت میں کھڑا کردے۔ لیکن وہ ایسا سوچ سکتا تھا، کرنہیں سکتا تھا۔

دس برس تک اس کے محکومانہ سے انداز نے اس کے اندر کے سارے شرارے جیسے بجھا دیے تھے۔ شبینہ کی صلاحیتوں سے، انداز سے، قابلیتوں سے اور کامیابیوں کی مرعوبیت نے سبطین عباسی کو اس سے کسی بھی معاملہ میں اختلاف رکھنے کا ہنر بھی چھین لیا تھا، لیکن یہ نفرت جو آج ابھری تھی اتنی بلاخیز تھی کہ سبطین عباسی کو اپنا آپ سلگتا محسوس ہونے لگا۔ بے اختیار اس نے بیڈروم کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ شبینہ کو جاگتا پا کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا، مگر اس وقت، وہ حیرت سے زیادہ غصہ میں تھا۔ شبینہ نے اس کے تاثرات دیکھے تو ابرو اچکائے مگر خاموش ہی رہی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی اپنے لیپ ٹاپ پر کام کررہی تھی۔ کرسٹل کی وہ لڑی اس کی دراز گردن میں سجی سبطین کو زہر لگ رہی تھی۔ شبینہ نے غیرمحسوس انداز میں سکرین پر موجود جس ونڈو کو بند کیا تھا اس پر سبطین کی نگاہ جا چکی تھی۔ ''میں پروفیسر تھامس سے پراجیکٹ ڈسکس کررہی ہوں، برا نہ مانو تو مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔'' وہ سپاٹ لہجے میں کہتی ہوئی دوسرے لفظوں میں اسے کہہ رہی تھی کہ وہ تنہائی چاہتی ہے، اس لئے سبطین کو کمرے سے باہر چلے جانا چاہیے۔ خاموش نظروں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے سبطین عباسی نے اگلے ہی لمحے رخ پھیر کر دروازے سے باہر قدم بڑھا دیے۔

غصہ اب آتش فشانی میں مزید بڑھ چکا تھا۔

''ہاں یہ میرا ہزبینڈ تھا۔'' دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی یہ جملہ سبطین کے کانوں میں پڑا۔ اسکی تصویر یقیناً وہ دیکھ چکا تھا جس سے شبینہ ویڈیو کانفرنس کررہی تھی۔ بس لمحہ بھر کو ہی وہ اس رخ پر گیا تھا اور لیپ ٹاپ میں فکسڈ کیمرے نے اگلے کو سبطین کی تصویر دکھا دی

تھی۔

گھنٹہ بھر خوب تلخ ترین جذبات کے ساتھ گزار کر ایک بار پھر اس نے بیڈروم میں قدم رکھ دیا۔ اب شبینہ اسے بڑے اطمینان سے سوتے ہوئے ملی۔ لڑی اس کی گردن میں بدستور موجود تھی۔ یہ وہ شبینہ ہے جو سوتے ہوئے بے آرامی کا عنصر ذرا برداشت نہیں کرتی، اور کیسے اب یہ اپنے عاشق کا لمس چمٹائے سو رہی ہے۔'' اسکی سوچیں زہر آلود ہو رہی تھی۔

اور پھر ان دونوں کے درمیان گفتگو کا کوئی موقع نہیں آیا اور شبینہ سو کر اٹھنے کے بعد کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے سویڈن روانگی کا تحریری پیغام چھوڑ کر سبطین کو بھول گئی۔ جب وہ گھر واپس آیا تو داخلی دروازے کی پشت پر ہی پیغام چسپاں تھا۔ اسے حیرت تھی کہ شبینہ نے ایک کال کر کے بھی اطلاع کی زحمت نہ کی۔ اس نے فوراً ہی فون ملایا تو وہ بند جا رہا تھا۔

سبطین جذبات کے اس مقام پر تھا جہاں ناگواری اور ناپسندیدگی کے ساتھ انتقام کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ اس نے میز پر ہمیشہ ہی رکھے قلم اور پیڈ سے چند الفاظ گھسیٹے اور اسی پیغام کے نیچے چسپاں کر کے اپنا بیگ جو اس نے کچھ لمحوں قبل ہی ہاتھ سے رکھا تھا، اٹھایا اور ٹورنٹو کی فلائٹ کے لئے ائیر پورٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے بچوں کو نزدیکی پارک سے پک کیا جہاں وہ اس وقت دوستوں کے ساتھ کھیل کود کر رہے ہیں۔ دونوں باپ کے اس طرح انکو ساتھ لے جانے پر حیران تھے۔

''پاپا، ماما 4 بجے کی فلائیٹ سے سویڈن گئی ہیں، اب ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اور ہمارا سامان؟''

انہوں نے باپ کے مختصر جواب پر کہ ''ہم ائیر پورٹ جا رہے ہیں۔ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ ''ہم اپنے ہی گھر ٹورنٹو جا رہے ہیں۔'' اس نے زچ ہو کر کہا تو وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ ''لیکن پاپا یہاں ہم کرسمس کی چھٹیاں گزارنے آئے تھے چھٹیاں شروع ہونے سے دو دن قبل ہم آ گئے تھے، اب جب چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں تو آپ واپس ٹورنٹو جا رہے ہیں اور ممی بھی سویڈن چلی گئیں۔ نہ جانے کون سی کانفرنس ان چھٹیوں میں ہے۔'' ذیشان کے لہجے میں شکوہ تھا۔ جبک وقاص بے فکری سے چیونگم چباتا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

سبطین نے ایک گہری نگاہ دونوں بیٹوں پر ڈالی اور اپنے آگ بھرے جذبات کو قابو میں کرنے لگا۔ جو

کچھ شبینہ کر رہی تھی وہ اس کی فہم سے بالاتر تھا لیکن جو کچھ وہ کر آیا تھا وہ یقیناً شبینہ کی فہم میں آ جائے گا، اس نے تنفر سے سوچا۔ ''بس اتنا ہی ہمارا تمہارا ساتھ تھا شبینہ۔'' اس جملے نے جیسے اس کی آنکھیں ایکدم سے نم کر دیں۔

اب اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔ اس نے شبینہ کو طلاق لکھ دی تھی۔ ایک نہیں پورے تین مرتبہ گویا دس سال بعد وہ سب کچھ ہوتے بھی گھر کا شیرازہ بکھیر چکا تھا۔ ''میں! میں نے بکھیرا؟'' وہ خود سے سوال جواب کر رہا تھا۔ اندورنی تاثرات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ دس سال تک بظاہر قابل رشک زندگی گزارنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں کیا کر ڈالا۔ اسے یہ احساس اب کچھ کہنے لگا تو وہ پہلو بدل گیا۔

ائیر پورٹ آ چکا تھا، کیب سے بچوں سمیت اتر کر وہ اندورنی عمارت کی جانب بڑھ گیا۔ دو گھنٹے بعد ٹورنٹو کے لئے فلائٹ تھی۔ بچوں نے راستے بھر اس سے خوب سوالات کئے تھے اور اب وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا تھا۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا ور وقاص نے باپ کو مخاطب کیا۔ ''پاپا! آپ ہمیں اصل بات کیوں نہیں بتا دیتے۔ کہ ہم ٹورنٹو کیوں جا رہے ہیں جبکہ ماما ملک سے باہر ہیں۔''

''ہم اس لئے بھی جا رہے ہیں کہ ماما ملک سے باہر ہیں۔'' اس نے بڑے ضبط سے جواب دیا۔ اسے خدشہ تھا کہ دونوں بیٹے کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جا رہے۔

ٹورنٹو کی فلائٹ کا انتظار کرنے کے دوران اس نے اپنے لیپ ٹاپ سے ٹورنٹو سے پاکستان جانے والی پہلی فلائٹ کی تلاش کی تو وہ اس کے ٹورنٹو پہنچنے کے آدھے گھنٹے بعد تھی یا پھر دو دن بعد۔ دو دن بعد کی فلائٹ میں 3 ٹکٹس کا حصول یقینی نہ تھا، ویٹنگ پر تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اور اپنا دونوں بیٹوں کا نام مطلوبہ ائرلائن میں ٹائپ کیا اور سسٹم آف کر کے آنکھیں موند لیں یہ وہی وقت تھا جب وقاص نے سوال کیا تھا۔ اس کی مندی آنکھوں تلے اس کی زندگی کسی فلم کی طرح رواں تھی۔

اس کا گھر جہاں وہ ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ جہاں اس کے خون کے رشتے تھے جن سے

ملے اسے پانچ برس ہو چکے تھے۔ اس نے پانچ برس میں کم ازکم پانچ مرتبہ ان سے ملاقات کا پروگرام بنایا لیکن ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا جہاں شبینہ کی نگاہ میں سبطین کے کیریر مضبوط اور شاندار کرنے کے مواقع ہوتے اور پھر جانا رہ جاتا۔ خود ہی وہ بھی ان پانچ برسوں میں اپنے رشتوں سے ملنے نہ گئی تھی لیکن وہ شبینہ کی طرح بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ پتھر کے بیوپاری کی بیٹی تھی، جبکہ وہ مسیحائی کرنے والے باپ کی اولاد۔ جذباتیت کا فرق دونوں میں بہت تھا۔ اسی فرق نے سبطین اور شبینہ کے تعلق کو اتنے سالوں تک استوار بہ خوبی رکھا تھا۔ شبینہ میں کہیں لچک کی کمی ہوتی تو سبطین کی نرم طبیعت زندگی کو رواں رکھتی تھی، لیکن اب سبطین زندگی کے اس موڑ پر کوئی نرمی نہ دکھا سکا تھا۔ اور یہ معاملہ شاید کسی نرمی کا بھی نہیں تھا۔ یا شاید وہ ایسا پریشر ککر بن گیا تھا جس کے ڈھکنے تلے خوب سٹیم جمع ہو چکی ہو اور اب اس بھاپ نے پوری قوت سے وسل اٹھا دیا ہو۔ جو قوت سے گھومتی ہوئی گرجدار آواز کے ساتھ متحرک ہو۔ سبطین کی کوئی آواز تو نہ بلند ہوئی تھی لیکن طلاق کے الفاظ کی گرج خاصی بلند ہی تھی جو فی الحال خاموش الفاظ کی صورت دروازے کے پیچھے چپکی تھی۔

جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

نہ جانے شبینہ کو کیسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سبطین ٹورنٹو جا چکا ہے، وہ جیسے ہی اپنے یا جسے شبینہ کا مکان کہنا چاہیے پہنچا تو شبینہ کی کتنی ہی کالز آئی ہوئی تھیں۔ وائس میسج کے ذریعے اسے کئی فکرمندی کے پیغامات بھی ملے۔ اپنا موبائل فون اس نے ابھی تک آن نہ کیا تھا۔ سو یہاں وہ رابطہ نہ کر سکی تھی۔ آن کرتے ہی یہاں بھی اسے کتنے ہی ایس ایم ایس بھی مل گئے جس میں شبینہ نے ہلکی پھلکی سی معذرت کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ وہ بہت جلدی میں سویڈن روانہ ہوئی کوئی اہم کانفرنس تھی جس کا وہ ذکر کرنا بھول گئی۔ سبطین نے بنا تاثر کے یہ سب پڑھا اور سنا اور اپنے ذہن میں موجود کاموں میں مصروف ہو گیا۔

بچے باپ کے ساتھ اٹھ گئے تھے لیکن ان کے موڈ میں باپ کے لئے واضح خفگی تھی۔ اور وہ اب اس کی کسی بھی بات پر کوئی جواب نہ دے رہے تھے۔ سوائے ہاں اور ناں والے سوالات کے کسی بھی تیسرے لفظ کی ادائیگی انہوں نے منقطع کر دی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف تھا۔ اپنے اکاؤنٹ کی معلومات آن لائن لیتے ہوئے اس کو کچھ آہٹ ہوئی تو اس نے ذیشان کو

دبے پاؤں کمرے سے باہر جاتے دیکھا، نہ جانے وہ کب اس کے بیڈروم میں آیا تھا، اسے علم بھی نہ ہوسکا او وہ کام میں ہی منہمک رہا۔ کچھ دیر اس نے ذیشان کے پیچھے بند ہوئے دروازے کو غائب دماغی سے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر کام میں مصروف ہوگیا۔ اس کے پاس محض دو دن تھے ان دو دنوں میں اسے بہت کچھ کرنا تھا۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے، اگلے دن سے کرسمس کی چھٹیاں شروع ہورہی تھیں۔ زندگی خاصی حد تک ان دنوں سست ہو جایا کرتی تھی۔ پروازوں میں نشست ملنا بھی محال ہوجاتا تھا۔ چونکہ اس نے پاکستان جانا تھا، اس لئے کچھ گنجائش نظر آرہی تھی اور تین نشستیں ویٹنگ پر تھیں۔ اسے بھرپور امید تھی کہ مل ہی جائیں گی لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو پھر.....؟ وہ اس سوال کو بوجھنا نہ چاہ رہا تھا اور دو دن بعد ہی کے انتظار میں تھا جب تک جو کام کرنے تھے وہ ان کو کرنے میں لگا ہوا تھا۔

ہیٹنگ سسٹم میں شاید کوئی رخنہ آ گیا تھا، اسے آن لائن کام کے دوران سرد جھرجھری سی محسوس ہونے لگی، اسی لمحہ سیل فون بھی کال کی آمد سے وائبریٹ ہونے لگا۔ شبینہ کا نام اسکرین پر دیکھ کر سبز بٹن دبا دیا۔

''السلام علیکم! سے اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی۔ کھردری اور جذبات سے عاری۔ ورنہ تو اس کی آواز میں بڑی حلاوت ہوتی تھی۔ خصوصاً جب وہ شبینہ سے بات کرتا تھا تو جذبے جیسے اس میں پروئے ہوتے تھے لیکن بس ایک کرسٹل لڑی، ایک کارڈ، ایک جملہ اور ایک سفر نے ان دونوں کے ایک ساتھ گزارے ایک نہیں دس سال تین لفظوں کے متواتر استعمال سے ختم کر دیئے۔ اس خیال کی لہر خاصی کاٹ دار تھی۔

اگلی طرف شبینہ اتنی سہولت سے، اطمینان سے بات کر رہی تھی جیسے اس کے روم روم میں خوشی پھوٹ رہی ہو۔

''کانفرنس بہت اعلیٰ ہے۔ مجھے لگتا ہے کرسمس کی چھٹیاں میری پوری یہیں گزر جائیں گی۔ اچھا ہوا تم بچوں کو لے کر ٹورنٹو آ گئے۔''

ہنی (honey) تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟'' سبطین کو شبینہ کی آواز کے عقب سے کوئی مردانہ آواز آئی تو ایک بار پھر اس کی رگیں تن گئیں۔ اور وہ جو خاموشی سے شبینہ کی بات سن رہا تھا۔ نشست سے بے اختیار کھڑا ہوگیا۔

''اچھا سبطین میں پھر بات کروں گی۔ پروفیسر تھامس کے ساتھ کسی پراجیکٹ کے لئے جانا ہے۔''

''اوکے!' سبطین نے سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر لیپ ٹاپ کو پراپر طریقے سے بند کرنے کے بجائے ڈائریکٹ آف کر دیا۔

''تم بچوں کو لے کر پاکستان کا ٹرپ لگا لو ان چھٹیوں میں۔ اچھا ہے تمہاری بھی تشنہ خواہش پوری ہو جائے گی۔''اس نے فون آف کرنے سے پہلے سبطین کو ہنستے ہوئے یہ جملہ کہا تو وہ ہوں کے بعد سرخ بٹن دباتے ہوئے بے سکون ہو چکا تھا۔

اس نے تصور میں شبینہ کو تھامس کے ساتھ خوش باش دیکھا تو ناقدری کے احساس نے اس کے وجود میں تھکان بھر دی۔''تو گویا میرے دس سال تم نے تھامس کو دان کر دیئے شبینہ بی بی! چلو اچھا ہی فیصلہ کیا میں نے جو بھی کیا۔

وہ تین الفاظ جو اوٹاوا میں اس کے فلیٹ کے داخلی دروازے پر چپکے تھے وہ زندگی کو یکسر تبدیل کر چکے تھے۔اسکی بھی اور شبینہ کی بھی، اس پیغام کو وصول کرتے ہی زندگی کا رخ اور ہی ہو جانا تھا۔''کیا اتنی معمولی سی بات پر میں اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی ماں کو چھوڑ دیا۔''وہ اب خود احتسابی کے دائرے میں کھڑا تھا ''نہیں جو بھی ہوا یہ شاید برداشت ختم ہونے کا اشارہ ہے، میں نے کبھی ایسی زندگی کو نہ پسند کیا تھا، جہاں وافر مقدار میں اردگرد آلودہ ماحول ہو اور مجھے طیب ملتا ہی نہ ہو۔''سبطین کا یہ جواز خاصا حقیقت تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ تو تھے لیکن اپنے اپنے مدار میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے پھرتے ہوئے۔ ایک فاصلہ مسلسل، ایک ربط مسلسل وقفہ وقفہ سے والی کیفیت تھی۔

شبینہ نے کیریئر بنانے، مقام بنانے اور سیکھنے کے مسلسل عمل میں یہ بھلا دیا تھا کہ عورت کو گھر بنانے کے لئے باہر کی دنیا کی ناموری کا شوق چھوڑنا پڑتا ہے۔ اپنے شوہر اور اپنے گھر میں مقبول ہونے کے لئے کامیاب رہنے کے لئے دوسری کامیابیوں کو نظر انداز بھی کرنا پڑتا ہے۔شبینہ نے باہر کی کسی بھی کامیابی کو کبھی بھی نہ چھوڑا تھا۔ چاہے اپنے اور سبطین کے کتنے ہی احساسات اور جذبات کچلے۔سبطین کی کسی بھی صنف نازک سے ہائے ہیلو سے زیادہ آشنائی کبھی نہ بڑھتی جبکہ شبینہ خاصی سوشل بھی تھی تو جذبات کا دباؤ سبطین پر ہی زیادہ بڑھا۔ صحیح غلط کے فلسفہ نے بھی اس کو ان

دائروں میں جانے سے باز رکھا جہاں شبینہ قدم رکھ لیا کرتی تھی۔ جیسے پروفیسر تھامس کے ساتھ کانفرنس کے لئے گئی تھی۔ ایسے ہی کئی بار اپنے کولیگز کے ساتھ کئی کئی دن کے لئے چلی جاتی تھی۔ کبھی کانفرنس، کبھی سیمینار تو کبھی کوئی لیکچر دینے۔

سبطین کو علم تھا یہ سب اس کی بیوی کے کیریئر اور شعبہ کی ضرورت ہے، سو اس نے نہ کبھی اعتراض کیا اور نہ برا مانا، خود وہ ہمیشہ شبینہ کے ساتھ نہ جا پاتا تھا۔ اس کی اپنی جاب بھی تھی اور اس کے اصول وضوابط شبینہ کے قدم بہ قدم رہنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ لیکن وہ کبھی چلا بھی جاتا تو اسے بوریت ہی ہوتی تھی۔ شبینہ بہت مصروف ہوتی اپنے کام کے ساتھ اپنے مداحوں کے ساتھ، اپنے کولیگز کے ساتھ، ایسے میں سبطین کو لگتا وہ نہ ہی آتا تو بہتر ہوتا۔ اب تو سب کچھ ہی ختم ہو چکا تھا۔ اسنے سوچوں کو توڑ کر ایک لمبی سانس لی۔

ان دنوں میں اسے بہت سے کام نمٹانے تھے، بچوں کو پاکستان جانے کے لئے تیار کرنا تھا۔ جبکہ ابھی حتمی طور پر یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ پاکستان جا بھی رہے ہیں یا نہیں، فلائٹ میں سیٹ ملنے پر انحصار تھا۔ اگلی صبح اس نے کچھ آفیشل کام کیے۔ سرکاری دفاتر بھی چھٹیوں کے زیر اثر تھے، بہر حال اس کا بنیادی اور ضروری کام کسی حد تک ہو گیا۔ بینک اکاؤنٹس سے رقم منتقل کرنی تھی۔ وہ اتنی جلدی نہ ہو سکی تھی۔ درخواست دے کر اس نے وطن جانے کے لئے کچھ خریداری کے لئے بازار کا رخ کیا۔

کرسمس سیل اپنے آخری دنوں پر تھی۔ لوگ جوق در جوق بازار میں نظر آتے تھے۔ وہ اور شبینہ بھی ہر سال تقریباً کتنی ہی شاپنگ ان دنوں کی سیل میں کیا کرتے تھے۔ اسے پھر شبینہ کی یاد آ گئی۔ بے اختیار اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا، وہ اس وقت ایک شاپنگ مال میں کھڑا تھا۔ سامنے ڈمی پر دیدہ زیب زنانہ سوئیٹر تھا۔ پچھلے برس کچھ ایسے ہی رنگ کا سوئیٹر اس نے شبینہ کے لئے خریدا تھا۔ اس کے قدم بے اختیار اس دکان کی طرف بڑھ گئے اور پھر کچھ دیر بعد وہ سوئیٹر خرید کر باہر نکلا تھا ایک بار پھر اس کے سامنے وہ چہرہ آ گیا۔

اس جگہ وہ اسے کہاں دکھائی دے سکتی ہے، وہ تو اسے اوٹاوا چھوڑ آیا تھا۔ کیا یہ اس کا الوژن ہے۔ اس نے نظر بچا کر نکلنا چاہا تو اب کے اسے لگا جیسے کسی نے اسے پکارا ہے۔ بے اختیار وہ گھوم گیا۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے کھڑی تھی۔ ایک بار پھر اسے اپنا نام سنائی

دیا۔اس کے لب ہلے تھے۔مطلب جو کچھ اسے دکھائی دے رہا تھا وہ الوژن نہیں تھا۔وہ اسکی طرف ایک قدم کھسک گیا۔ براؤن اسکارف اس کی بھوری آنکھوں کا ہی ہم رنگ لگ رہا تھا۔''دھنک!''اس کے ہونٹوں سے سرگوشی کی سی آواز نکلی۔''یہ تم تم ہونا دھنک!''اس نے پھر اپنے آپ سے جیسے کہا۔ایسی بے اختیاری سے اس نے دھنک کو کبھی نہ دیکھا تھا۔دھنک کی گردن اثبات میں ہلی تو سبطین نے گہری سانس لی۔

''میں یہاں کچھ پوسٹ گریجویٹ کورسز کرنے اسکالرشپ پر آئی ہوں۔''اس نے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ سبطین کو بتایا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''میرے ہزبینڈ او رمیرے درمیان علیحدگی ہوچکی ہے۔''اس نے جیسے سبطین کی نگاہیں پڑھ لیں، ہمیشہ کی طرح،''بچے امی کے ہاں چھوڑ کر سال بھر کے لئے آئی تھی۔ پرسوں واپس جارہی ہوں۔اوٹاوا میں تمہاری جھلک دیکھی تھی تو دل چاہا کہ ملاقات کروں،تمہیں پتہ بھی نہ چلا میں نے تمہیں کب ٹریس کیا اور پھر جب ملاقات کے لئے پہنچی تو گھر بند تھا۔ پورا دن میں نے تمہارے گھر کے اردگرد کتنے چکر لگائے،تمہاری بلڈنگ کے لوگ بھی آتے جاتے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔''وہ دھیما سا ہنسی۔

اس کی ہنسی کا جلترنگ کہیں کھو گیا تھا۔''پھر ٹورنٹو واپس آ گئی کہ فلائٹ میری ٹورنٹو سے ہے۔اوٹاوا میں کسی کام سے گئی تھی۔ یونیورسٹی میری اسی شہر میں ہے۔''دھنک نے دوسرے رخ پر قدم بڑھائے،اس نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔

سبطین نے ہاتھ میں پکڑا سوئیٹر کا پیکٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔اور اس کے ساتھ ہی چلنے لگا۔اس نے پیکٹ ایسے تھاما گویا سبطین کے پاس اس کا کوئی سامان تھا جسے وہ واپس لے رہی ہو۔ اب دونوں خاموش تھے۔دھنک کا رخ شاپنگ مال کے خارجی دروازے پر تھا۔ باہر آ کر اس نے سبطین کے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگز پر نظر ڈالی جو اس نے سوئیٹر کے علاوہ اس اسٹور سے سامان خریدا تھا۔جن میں لیڈیز ہینڈ بیگز اور کچھ شوز تھے، جو اس نے بہنوں اور بھابھی کے خیال سے لئے تھے۔

''تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''

''اس طرف نہیں۔تم گیٹ نمبر ٹو سے نکلی ہو وہ ون پر ہے۔''سبطین نے دھنک کو جواب دیتے ہوئے

جیب میں ہاتھ ڈال کر چیونگم کا پیکٹ نکالا۔ ''تم ابھی تک چیونگم چباتے ہو؟'' دھنک نے تعجب کیا تو وہ ہنس پڑا۔

اسے اپنی ہنسی پر خود حیرت ہوئی کہ اتنے دباؤ کے ساتھ اس کو ہنسی کیسے آ گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کا ذہنی دباؤ تو جیسے تحلیل ہو چکا ہے، اور اب وہ دھنک کے ساتھ جیسے ہلکا پھلکا گھوم رہا ہے۔ شاید یہ دھنک کے ساتھ کا اثر تھا یا اس بات کی اطلاع کا کہ وہ اب کسی کی بیگم نہیں اور خود وہ بھی کسی کا صاحب نہیں۔

آؤ چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں گاڑی کی جانب جانے کے لئے قدم بڑھائے تو وہ ساتھ چل پڑی۔ پھر دونوں خاموش تھے۔ نہ وہ اسے اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا جہاں اس کے بیٹے تھے، اور نہ دھنک نے کچھ کہا۔ ''میں پرسوں پاکستان جانا چاہتا ہوں لیکن سیٹ کنفرم نہیں ہے۔'' سبطین نے خاموشی کو توڑا تو اس نے چونک کر اس کو دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ سبطین نے قدم نہ روکے تو وہ پھر چل پڑی۔ ''اکیلے جا رہے ہو؟''

''نہیں، بیٹوں کے ساتھ۔''

''اور شبینہ؟''

''وہ ٹورنٹو میں ہے۔''

ان دونوں کے درمیان مختصر سے سوال جواب کے دوران سبطین گاڑی تک پہنچ کر دروازہ کھول چکا تھا۔ اس کو پتہ سمجھاتے ہوئے وہ کسی سوچ میں گم تھی۔ پھر اس کے مطلوبہ پتے پر پہنچ کر وہ نیچے اتری، ''جزاک اللہ سبطین!'' کہا اور پیکٹ تھام کر جانے کے لئے مڑ گئی۔ سبطین نے اسکو جاتا دیکھا اور خود بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔

''کتنی عجیب اور کتنی خاموش ملاقات تھی یہ!'' وہ سوچ رہا تھا۔ ورنہ دھنک ساتھ ہو تو سبطین کے پاس باتیں کرنے کے ڈھیروں موضوعات ہوتے تھے۔ اب تو جیسے خاموشی کا پہاڑ تھا۔ جس پر کچھ خراشیں، کچھ جملوں سے آ گئی تھیں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو نسبتاً بہتر محسوس کر رہا تھا۔

''یہ دھنک کی علیحدگی کیوں ہوئی؟'' ایک دم اسے دھیان آیا، لیکن اس دوران زیبرا کراسنگ آ گئی تھی اور اسے گاڑی اور خیال دونوں ہی روکنے پڑے۔ لوگوں کا خاصا بڑا گروپ روڈ کراس کر رہا تھا۔ اسے بے اختیار یاد آیا کہ اس نے دھنک سے اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں لیا۔ اپنے آپ کو کوستے ہوئے وہ کچھ افسوس زدہ سا ہو گیا۔ گھر پہنچ کر اس کے بتائے ہوئے

ایڈریس کے مطابق لینڈ لائن نمبر آن لائن سرچ کیا تو جو نمبر ملا وہ اس نے اپنے سیل فون میں محفوظ کرلیا۔ ''چلو کچھ تو ٹریس ہوا۔'' اطمینان سے کہتے ہوئے سامان پر تنقیدی نگاہ ڈالنے لگا۔ شبینہ اور اپنا معاملہ اب جیسے اس کے لئے دردسر رہا ہی نہیں تھا۔ اسے لگا جیسے وہ شبینہ سے اب خفا بھی نہیں۔ بہت جلد دوسرا خوشگوار روزن کھل گیا تھا۔ سامان سے فارغ ہوکر اس نے دونوں بچوں سے بات کرنے کا سوچا، وہ ابھی کچھ لمحوں قبل ہی باہر کھیل کر لوٹے تھے۔ اس نے ان دونوں کو بلایا اور بنا تمہید باندھے یہ بتایا کہ پرسوں وہ پاکستان جارہے ہیں۔ اور یہ بات ان کی ممی نے کی ہے۔ وقاص اور ذیشان دونوں نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تو وہ چونک پڑا۔

''ممی کا فون آیا تھا، وہ ہم سے بھی کہہ رہی تھیں، لیکن آپ نے یہ سب انتظام بڑی جلدی کرلیا۔'' وقاص کی بات پر وہ دھیمے سے مسکرانے لگا۔

''ویٹنگ پر ہے سیٹ لیکن امید ہے مل جائے گی۔''

''سیٹ کہ سیٹز؟'' ذیشان نے سوال کیا۔

''ہم تینوں ہی کی ویٹنگ پر ہیں۔'' اس نے جواب دے کر اس کے کندھے پر دھیما سا ہاتھ مارا۔

''ممی کب ہم کو جوائن کریں گی؟''

''کچھ اندازہ نہیں۔'' ذیشان کی بات پر وہ یکلخت سنجیدہ ہوگیا۔ ''تم لوگ اپنی پیکنگ کرلو۔ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔'' دونوں بچوں نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ گئے۔ ان کے اٹھنے کے بعد اس کا دل چاہا کہ وہ شبینہ کو فون کر کے اطلاع دے کہ وہ اور سبطین عباسی اب کسی رشتہ میں نہیں ہیں۔ نہ جانے وہ اپنے آپ کو ہر کولیس کیوں سمجھ رہا تھا۔ شاید یہ دھنک سے ملاقات کا اثر تھا ورنہ اس سے قبل تو وہ بہت ڈاؤن تھا۔

اسی لمحہ سے اس کا موبائل بجا تو فون سکرین پر شبینہ کا نام آرہا تھا بددلی سے ریسیو کرتے ہوئے اس نے بات کی ابتدا کی تو شبینہ نے بھی محسوس کرلیا۔ اس نے دس سال سبطین عباسی کو اپنا گرویدہ ہی دیکھا تھا۔ آج تو اس کی آواز ہی بدلی ہوئی تھی۔

''سوری شبینہ میں ذرا کمرے کو سمیٹنے میں مصروف ہوں، پھر بات کرینگے۔ تم کب واپس لوٹو گی؟ اور کہاں آؤ گی اوٹاوا یا ٹورنٹو؟ اوٹاوا واپس آنا تمہارا کچھ سامان وہاں ہے وہ لیتی آنا۔'' شبینہ نے حیرت سے اس کی بات سنی اور ''اوکے'' کہہ کر فون بند کردیا۔ اسے سبطین کا انداز اور بات دونوں ہی چونکا رہے تھے۔

شبینہ کے فون سے فارغ ہو کر اس نے دھنک کو سوچنا شروع کر دیا۔ وہ ارادہ کر چکا تھا کہ اگلے دن اس کے پتہ پر ضرور جائے گا۔

اگلے دن اس نے ایک بار پھر سیٹس کے متعلق استفسار کیا تو یہ اچھی خبر ملی کہ خاصے چانس ہیں ملنے کے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دھنک کے پتہ پر روانہ ہو گیا۔ ''نہ جانے وہ ملے گی بھی یا نہیں کہیں باہر نہ گئی ہو۔'' دن کے دس بج رہے تھے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے بچوں کے کمرے میں جا کر ان کے بیگ خود تیار کر دیئے تھے۔ کچھ سامان کی خریداری اسے آج بھی کرنی تھی۔ ویسے جس قسم کی صورتحال میں وہ پاکستان لوٹ رہا تھا اس میں تحفے تحائف خریدنے ایک مرحلہ ہی تھا۔ لیکن وہ اتنے عرصہ بعد خالی ہاتھ بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کا دل ان لوگوں سے ملنے کو بے چین ہو گیا تھا، کتنا بھی سکائپ پہ بات کر لو جو بات ابا، اماں کے گلے لگنے میں تھی وہ سکائپ پہ کدھر۔ وہ دیکھ چکا تھا ابا بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں۔ دیس کے انہی خیالات میں رہتے ہوئے وہ دھنک کے پتہ پر پہنچ گیا۔

وہ مل گئی تھی۔ اسے دیکھ کر قطعاً حیران نہیں ہوئی۔ بلکہ اسی طرح جیسے سوئیٹر کا پیکٹ اس نے لیا تھا۔ جیسے یہ تو لینا ہی تھا۔ جیسے اسے پتہ تھا کہ سبطین نے آنا ہی ہے۔

''اگر میرا اور تمہارا ملنا محض اتفاق ہوتا تو ایک مرتبہ تمہاری جھلک دیکھنے کے بعد ٹورنٹو میں تمہیں ڈھونڈنا آسان نہ ہوتا۔ میرے پاس تمہارا پتہ نہیں تھا۔'' اس نے سبطین کو اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔ وہ کسی فیملی کے ساتھ ان کے گھر میں کرائے دار تھی۔

''کیوں مشکل تھا آن لائن سرچ کرتیں تو سبطین عباسی ٹورنٹو میں محض میں ہی ہوتا۔''

''نہیں تمہارے علاوہ چار اور تھے۔'' اس نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے آئس ٹی کا کین اس کی طرف بڑھایا تو سبطین نے اس کو اچنبھے سے دیکھا

''واقعی چار تھے؟'' اس کے اس طرح سوال کرنے پر دھنک مسکرا اٹھی۔

''تم کل پاکستان جا رہے ہو؟''

دھنک نے اپنے کین سے گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا تو اس نے محض ''ہوں'' کہا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

''تمہارے ساتھ''

اس کی اس بات پر لمحہ بھر کو ایک رنگ چہرے پر آ کر گزر گیا۔

''میرا ساتھ تو تم نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا سبطین عباسی۔'' اب اس کی آواز میں کچھ نمی سی آئی سبطین کو لگی۔ اس نے بے اختیار شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

''اب تو ساتھ چلو۔ سبطین کی بات پر دھنک نشست سے کھڑی ہو کر کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی۔

''تم پکا جا رہے ہو کل، سیٹس کنفرم ہو گئیں؟''

''ہاں'' اس نے دھنک کے سوال کا محض ہاں میں جواب دیا اور اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے تو چلتے ہیں ساتھ۔'' اس نے یہ جملہ کہا اور واپس نشست پر آ گئی۔

سبطین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بتائے کہ اس کا اور شبینہ کا کیا معاملہ ہے، اور یہ کہ وہ اب اس کے ساتھ ساری زندگی ساتھ چلنے کو تیار ہے۔ لیکن یہ وقت اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ آئس ٹی ختم ہوتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے تو کل ائیر پورٹ پر ملاقات ہو گی۔ تمہاری ائر لائن کونسی ہے؟''

''کل صرف ایک ہی پاکستان کے لئے کنیکٹڈ فلائٹ ہے۔ تم بھول گئے شاید۔'' دھنک نے ائر لائن کے سوال پر سبطین کو جواب دیا تو وہ دھیمے سے مسکرانے لگا۔

''مجھے پتہ ہے تبھی تم سے کہا تھا ائر پورٹ پر ملاقات ہو گی۔ ائر لائن کا سوال اب تمہارا چٹکلہ بھرا جواب سننے کے لئے کیا تھا۔'' اسکی اس بات پر وہ اسے گھور کر رہ گئی۔ اور وہ جانے کے لئے دروازے کی جانب مڑ گیا۔

تین دن قبل اسے جو سانحہ لگ رہا تھا وہ جیسے دھنک رفیع سے ملتے ہی تحلیل ہوتا جا رہا تھا اسے نہ اوٹاوا یاد تھا اور نہ شبینہ کا دھیان۔ بس یاد تھا تو یہ کہ کل دھنک رفیع کے ساتھ سفر کرنا ہے۔ یہ وہ سفر تھا جو وہ دس سال قبل کرنے کا سوچ بھی نہ رہا تھا۔ اس وقت کے جذبات اور ترجیحات نے اس سے وہ فیصلہ کرایا تھا جو اس کی اندرونی کیمسٹری سے قطعاً مطابقت نہ رکھتا تھا۔ وہ مادی طور پر خوب پھلا پھولا لیکن اندرونی طور پر خالی ہوتا چلا گیا۔ کل کے سفر نے اس کو آئندہ زندگی کے لئے بہت ہی پرامید کر دیا تھا۔ اس کے فیصلہ کے اثرات کس

حدتک اور کہاں تک جائینگے۔اس سے بے نیاز وہ محض خوش گمانیوں اور خوش آئند مستقبل کے تانے بانے بننے میں لگ گیا تھا۔

دل کا دیا خوب لو دے رہا تھا۔ یہ تو آنے والے وقت اور حالات نے ہی بتانا تھا کہ راتوں رات ماضی کی جانب لوٹنا ممکن رہا تھا یا نہیں۔ فی الحال تو دھنک رفیع کے نام سے اس کا دل ہرا بھرا ہو چکا تھا۔شبینہ کے نام کا صفحہ جیسے بھربھرے کاغذ کی طرح بکھر چکا تھا۔ایسے جیسے دس سال نہیں بلکہ دس منٹ گزارے ہوں۔

''بوند بوند ترس گیا ہوں، ابر بن کر چھا جاؤ۔ دل پر ہاتھ رکھ کر میرے مسیحا بن جاؤ۔'' دھنک رفیع سے تصور میں مخاطب ہو کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

(ختم شد)

☆☆☆

ملکہ زبیدہ

پانچویں عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی ملکہ کا نام زبیدہ تھا۔ زبیدہ کے والد کا نام جعفر اور دادا کا نام ابوجعفر منصور تھا جو دوسرے عباسی خلیفہ تھے۔

زبیدہ 145ھ میں موصل میں پیدا ہوئی اس وقت اس کے والد موصل کے گورنر تھے۔ والد نے اپنی بیٹی کا نام امۃ العزیز رکھا اور بڑے ناز ونعم سے اس کی پرورش کی۔ ابھی زبیدہ پانچ سال کی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ یتیم رہ گئی تب اس کے دادا نے اسے بغداد بلالیا۔ ننھی امۃ العزیز بے حد خوبصورت تھی دادا نے اس کی تروتازہ رنگت کی وجہ سے اس کا نام زبیدہ رکھ دیا۔ زبیدہ کے معنی ہیں ملائی، مکھن یا گیندے کا پھول۔ یہ نام اتنا مشہور ہوا کہ لوگ اس کے اصل نام امۃ العزیز کو بھول گئے۔ کنیت ام جعفر تھی۔

ابوجعفر منصور نے اپنی پوتی کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام کیا اور تعلیم دینے کے لئے بغداد کے قابل ترین اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ زبیدہ نہایت ذہین بچی تھی۔ اس نے نہایت ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کی، دینی علوم اور عربی ادب میں دسترس حاصل کرلی اور قرآن وحدیث کو اس نے دل کا نور بنالیا۔ جلد ہی اس نے علم وفضل میں نہایت بلند مقام حاصل کرلیا۔ جوان ہونے پر وہ حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ سیرت سے بھی مالا مال تھی۔

145ھ میں اس کے دادا نے اس کے چچا مہدی (خلیفہ بغداد) کے بیٹے ہارون الرشید کے ساتھ شادی کردی۔ نہایت شان وشوکت کے ساتھ شادی انجام پائی۔

مہدی کی وفات کے بعد زبیدہ کے شوہر کا بڑا بھائی ہادی خلیفہ بنا۔ 170ء میں اس نے وفات پائی تب ہارون الرشید مسند خلافت پر بیٹھا اور زبیدہ کو ایک وسیع وعریض سلطنت کی خاتون اول ہونے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔

ہارون الرشید کا تئیس سالہ دور حکومت ملکہ زبیدہ کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ گرچہ وہ امور مملکت میں

دخل نہیں دیتی تھی مگر اس کے اثر ورسوخ کی بھی کوئی حد نہ تھی۔

زبیدہ نہایت خوش پوش، مخیّر، رحمدل اور علم دوست خاتون تھی۔ ایک طرف تو اس کے جاہ وچشم کا یہ حال تھا کہ اس کا ایک ایک جوڑا ہزاروں دینار میں تیار ہوتا تھا، اس کی جوتیاں ہیروں اور موتیوں سے مزین ہوتی تھیں۔ اس کے محل میں عنبر کی شمعیں جلتی تھیں، اس کے باروچی خانے کا یومیہ خرچ دس ہزار درھم تھا اور سینکڑوں لوگ اس کے دسترخوان پر پرورش پاتے تھے۔

دوسری جانب اس کی دینداری کی یہ کیفیت تھی کہ اس کے حرم میں سو کنیزیں قرآن حکیم کی حافظ تھیں جو باری باری نہایت خوش الحانی سے قرآن حکیم کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ اس طرح اس کا محل ذکر الٰہی سے معمور رہتا تھا۔

علماء وشعراء کی بھی بہت قدردان تھی اور بعض کو مستقل وظیفے دیتی تھی وہ نماز روزے کی سختی سے پابندی کرتی تھی۔ زندگی میں کئی بار حج کی سعادت حاصل کی اس میں ایک پاپیادہ حج بھی تھا۔

ملکہ کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے بے حد دلچسپی تھی۔ ان پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتی۔ عراق سے مکہ مکرمہ کو جو راستہ جاتا تھا اس پر حاجیوں اور مسافروں کیلئے موزوں مقامات پر سرائیں بنوائیں اور کنوئیں کھدوائے۔ یہ راستہ تیز ہواؤں یا آندھیوں کی وجہ سے اکثر ریت سے اٹ جاتا تھا اور مسافر صحرا میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ ملکہ زبیدہ نے لاکھوں دینار خرچ کر کے راستے کے دونوں طرف پتھر کی مضبوط دیواریں بنوادیں تاکہ کسی کو راستہ معلوم کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ ملکہ نے صرفِ کثیر سے کئی مسجدیں بھی بنوائیں۔ علاوہ ازیں ایک نہر عرعار کوہِ لبنان سے بیروت تک بنوائی جس کے پل آج تک قناطر زبیدہ کے نام سے مشہور ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ ملکہ زبیدہ نے تبدیل آب وہوا کے لئے سرزمین ایران میں ایک پرفضا مقام پسند کر کے وہاں شہر تبریز آباد کیا۔ سید امیر علی کہتے ہیں کہ مصر کا قدیم شہر اسکندریہ جو دوسری صدی ھجری میں قریب قریب بالکل اجڑ گیا تھا، ملکہ زبیدہ کے حکم سے اس کو از سرنو تعمیر کیا گیا۔ ملکہ زبیدہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اس نے خواب دیکھا کہ میں برسرراہ پڑی ہوں اور جو کوئی آتا ہے میری بے حرمتی کر کے چلا جاتا ہے اس نے کنیز کو ایک عالم کے پاس

بھیجا کہ جا کر اس خواب کی تعبیر بیان کرے۔ خواب کو اپنی طرف منسوب کرتے شرم آئی اور کنیز سے کہہ دیا کہ تم اس خواب کو اپنا خواب کہہ کر بیان کرنا اور اس کی تعبیر معلوم کر کے آنا، جب عالم نے کنیز سے یہ بات سنی تو کہا تیری کیا ہستی ہے جو تو یہ خواب دیکھے اور اسے کچھ تعبیر نہ بتائی۔ کنیز ناامید ملکہ کے پاس آئی اب ملکہ نے مجبور ہو کر اسے کہا کہ جاؤ جا کر میرا نام بتادو اور تعبیر معلوم کر کے آؤ۔ جب ان عالم کو معلوم ہوا کہ یہ خواب ملکہ نے دیکھا ہے تو وہ کہنے لگے ہاں یہ بات درست ہوسکتی ہے ا ورانہوں نے اس کی یہ تعبیر بتائی کہ ملکہ سے کوئی ایسا کام ہوگا جو مدت العمر عوام کو نفع پہنچاتا رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ کے اس خواب کی تعبیر نہر زبیدہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

ملکہ زبیدہ کا سب سے بڑا کارنامہ جو اس کا نام قیامت تک زندہ رکھے گا ''نہر زبیدہ'' کی تعمیر ہے۔ ہارون الرشید کے دورِ خلافت سے کئی سال پہلے مکہ معظّمہ میں پانی کی قلت پیدا ہوگئی تھی اور حاجیوں کو سخت تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔ ایک دفعہ تو مکے میں پانی کا ایسا قحط ہوا کہ ایک مشکیزہ دس درھم اور بڑی مشک ایک اشرفی میں ملتی تھی۔ ملکہ زبیدہ کو جب حجاج اور اہل مکہ کی مصیبت کا علم ہوا تو اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ کوئی ایسا مستقل انتظام کرے گی جس سے مکے والوں کو پانی برابر ملتا رہے اور ہر سال حاجیوں کو بھی خوب پانی ملے۔

اس نے بڑے بڑے ماہرین تعمیرات اور انجینئروں کو طلب کیا اور حکم دیا کہ مکہ کے نواحی علاقوں میں چشمے تلاش کریں۔ ان ماہرین نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ملکہ کو اطلاع دی کہ انہوں نے دو جگہوں پر چشمے ابلتے دیکھے ہیں۔ ایک چشمہ تو مکہ معظّمہ سے پچیس میل کے فاصلے پر طائف کے راستے میں ہے اور دوسرا چشمہ کرا کی پہاڑیوں میں نعمان نام کی ایک وادی میں ہے لیکن ان چشموں کا پانی مکہ معظّمہ تک لے جانا بہت مشکل ہے کیونکہ راستے میں متعدد پہاڑیاں ہیں۔ نیک دل ملکہ نے حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو سکے ان چشموں کا پانی مکہ معظّمہ تک پہنچانے کے لئے نہر کھودو اس کام پر خواہ کتنا ہی روپیہ خرچ ہو جائے اس کی کچھ پروا نہ کرو اگر کوئی مزدور ایک کدال مارنے کی اجرت ایک اشرفی بھی مانگے تو اسے دے دو۔

ملکہ کا حکم ملتے ہی انجینئروں نے بے شمار کاریگروں اور مزدوروں کی مدد سے نہر کھودنے کا کام شروع کر دیا۔ یہ لوگ مسلسل تین سال تک دن رات

پہاڑیاں کاٹنے اور نہر بنانے میں مشغول رہے۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت شاقہ کو بارآور کیا اور نہر تیار ہوگئی۔ اس کام پر ملکہ کے سترہ لاکھ طلائی دینار خرچ ہوئے۔ جب ملکہ کے سامنے اخراجات کا حساب پیش کیا گیا تو وہ دریائے دجلہ کے کنارے اپنے محل میں بیٹھی تھی اس نے حساب کے کاغذ پر سرسری نظر بھی نہ ڈالی اور سب کاغذات کو یہ کہہ کر دریا میں ڈال دیا کہ ہم نے اس حساب کو ''حساب کے دن'' کیلئے چھوڑ دیا کیونکہ یہ کام میں نے اللہ کو راضی کرنے کیلئے کیا ہے اگر میرے ذمہ کسی کو کچھ دینا آتا ہو تو وہ مجھ سے لے لے اور اگر میرا کسی کے ذمہ کچھ باقی ہو تو میں نے اسے معاف کیا۔

پھر ملکہ نے نہر کی تعمیر میں حصہ لینے والے تمام ماہرین کاریگروں اور مزدوروں کو دل کھول کر انعام دیا اور بڑی خوشی منائی۔ دونوں چشموں سے دو الگ الگ نہریں نکالی گئیں آگے چل کر یہ دونوں نہریں ایک دوسرے سے مل گئیں اور پھر یہی ایک نہر عرفات تک چلی گئی اسی نہر کا نام ''نہر زبیدہ'' ہے۔ پہاڑوں کے اندر راستے میں جگہ جگہ حوض بھی بنائے گئے تاکہ بارش کا پانی بھی ان حوضوں میں جمع ہوکر نہروں میں شامل ہوتا رہے۔ نہروں کی گزرگار کو ایسے مصالحے سے بنایا گیا ہے کہ پانی زمین کے اندر جذب نہیں ہونے پاتا اس علاقے میں اکثر ریت کے طوفان آتے رہتے ہیں اس لئے نہروں کو اوپر سے پاٹ دیا گیا تاکہ ریت ان میں گرنے نہ پائے۔

شروع شروع میں نہر زبیدہ کا نام ''عین المشاش'' تھا لیکن اللہ نے زبیدہ کے نام کو دوام بخشا اس لئے بعد میں وہ اسی کے نام سے مشہور ہوگئی۔ یہ نہر مکہ معظّمہ سے چند میل جبل عرفات کے ساتھ ساتھ بہتی ہوئی ایک مقام ''چاہ زبیدہ'' پر ختم ہوجاتی ہے۔ وہاں تک اس کی کل لمبائی ۳۳ ہزار میٹر ہے۔ ملکہ کی خواہش تھی کہ نہر خاص مکہ معظّمہ شہر تک پہنچ جائے لیکن کوئی ایسی رکاوٹ پیش آگئی کہ اسے چاہ زبیدہ تک ہی ختم کرنا پڑا۔ پھر بھی اہل مکہ کو اس سے بڑا آرام ہوگیا کیونکہ چاہ زبیدہ سے مکہ تک پانی مختلف طریقوں سے شہر میں آتا رہتا تھا۔ نہر پر پانی کی تقسیم کیلئے جگہ جگہ حوض اور کنویں بنے ہوئے ہیں۔

ایک بہت مشہور واقعہ ہے ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید سر شام دجلہ کی سیر کو نکلا ملکہ زبیدہ بھی ہمراہ تھی۔ دریا کے کنارے انہوں نے ایک مجذوب شخص کو دیکھا

کہ وہ مٹی کے گھروندے بنا رہا ہے۔ ہارون الرشید نے پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

بولا ''جنت کا گھروندا ہے خریدو گی؟''

''بصد شوق'' ملکہ نے اشتیاق ظاہر کیا۔ ''کتنے لو گے؟''

سوال ہوا ''جتنے ہیں سب دے دو۔''

ملکہ نے ایک قیمتی موتی مجذوب کے حوالے کر دیا۔

رات کو ہارون رشید نے خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا آبدار موتی ہے، اتنا بڑا کہ اس میں ایک شاندار محل بنا ہوا ہے اس کی پیشانی پر لکھا ہے ''قصرِ زبیدہ'' ہارون الرشید اس میں داخل ہونا چاہتا ہے تو درشت رو دربان اسکو روک لیتے ہیں کہ زبیدہ کے محل میں اجنبی داخل نہیں ہوسکتا۔ آنکھ کھلتے ہی ہارون الرشید نے ایک ہی فکر کی کہ وہ سودا جو کل نہ ہوسکا آج ہوجائے۔ شام ہوئی سیر کو نکلا۔ مجذوب دریا کنارے موجود تھا، گھروندے بنا رہا تھا ''یہ کیا ہے؟''

بولا ''ریت کے گھروندے''

وہ وہ جو جنت کے گھروندے تھے وہ کیا ہوئے؟'' ہارون نے پوچھا۔

''میاں وہ غیب کا سودا تھا۔ مشاہدے کے بعد شوق شوق نہیں رہتا لالچ کہلاتا ہے۔''

ملکہ زبیدہ کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رہتا تھا اس نے اپنے دو بیٹوں کو امام ابو یوسفؒ کے پاس تعلیم و تربیت کیلئے بھیجا اور ان سے عرض کیا کہ آپ ان کو علم اور ادب کی تعلیم دیجیے ان دونوں شہزادوں کے نام امین الرشید اور مامون الرشید تھے۔ استاد صاحب نے بڑی توجہ اور دلجمعی سے دونوں کی تربیت کی۔ کچھ عرصہ بعد ملکہ نے ہارون رشید کو بھیجا کہ وہ دیکھ کر آئیں کہ بچے کیسی تربیت حاصل کر رہے ہیں؟ چنانچہ بادشاہ امام ابو یوسفؒ کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ امام صاحب وضو کر رہے ہیں اور ان کا بیٹا جو اس وقت کا شہزادہ تھا وہ لوٹے سے پانی ڈال کر امام صاحب کو وضو کروا رہا ہے۔ ہارون رشید کھڑے ہو کر دیکھتے رہے جب وضو کر کے فارغ ہوئے تو امام صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ امام ابو یوسفؒ سے عرض کرنے لگے میری بیوی نے تو بچوں کو اس لئے بھیجا تھا کہ آپ ان کو ادب سکھاتے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے ان کو یہ ادب ہی سکھایا ہے کہ میں وضو کر رہا تھا اور یہ شہزادہ ہو کر پانی ڈال رہا تھا۔ انہوں نے

کہا نہیں میری بیوی یہ چاہتی ہے کہ آپ ان کو ایسا ادب سکھاتے کہ یہ ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے آپ کے پاؤں کو مل کر دھو رہا ہوتا۔

ملکہ زبیدہ کا اپنا بیٹا امین الرشید تھا اور مامون اس کا سوتیلا بیٹا تھا۔ ملکہ نے اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے امین الرشید کو بادشاہ کا ولی عہد نامزد کروا دیا حالانکہ مامون الرشید اسکا زیادہ اہل تھا۔ ہارون الرشید نے امین کے بارے میں وصیت کی کہ اس کے بعد وہ ولی عہد ہوگا۔ ساتھ ہی اس نے ان کے درمیان ملک کی تقسیم بھی کردی۔ 193ء میں ہارون الرشید نے وفات پائی تو امین بغداد پہنچ کر تختِ خلافت پر بیٹھ گیا۔ مامون اس وقت مرو میں تھا وہ کچھ عرصہ تو خاموش رہا اور انہی علاقوں پر قناعت کی جو باپ نے اس کے سپرد کیے تھے مگر جب امین نے اس کی ولی عہدی کو منسوخ کر کے اپنے صغیر السّن بیٹے موسیٰ کو ولی عہد نامزد کیا تو دونوں بھائیوں میں شدید مخالفت کا آغاز ہوگیا۔ دونوں بھائیوں میں بہت سی معرکہ آرائیاں ہوئیں جن میں ہر دفعہ مامون کا پلڑا بھاری رہا۔ آخر کار مامون کی فوجوں نے بغداد کا محاصرہ کرلیا اور یہ محاصرہ پورے ایک برس تک رہا۔ آخر امین نے شکست کھائی اور مامون کے جرنیل طاہر بن حسین نے اسے گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔

اب مامون الرشید تمام سلطنت عباسیہ کا بلاشرکت غیر فرمانروا بن گیا۔ ملکہ زبیدہ نے جب اپنے فرزند کے قتل کی خبر سنی تو فرطِ غم سے نڈھال ہوگئی۔ ملکہ کو شعروشاعری پر بھی عبور حاصل تھا ملکہ نے ایک پردرد مرثیہ لکھ کر مامون کو بھیجا۔

مرثیہ کا ترجمہ یہ ہے۔

''ام جعفر کی طرف سے یہ خط ہے خلیفہ مامون کے نام جو کہ پہلوں کے علم وفہم کا وارث ہے۔ اے بنِ ا عم میں تجھ کو لکھ رہی ہوں اور میری آنکھیں پلکوں سے خون بہاتی ہیں۔ مجھ کو ذلت، اذیت اور رنج پہنچا اور فکر نے میری آنکھوں کو بے خواب کر دیا۔ یہ طاہر کیا ہے خدا جس کو طاہر نہ کرے اور جو کچھ اس نے کیا ہے اس کے الزام سے پاک نہیں ہوسکتا۔ اس نے مجھ کو برہنہ سر اور بے پردہ گھر سے نکالا اور میرا مال لوٹ لیا اور میرے مکانات برباد کر دیے۔ اس یک چشم ناقص الخلقت کے ہاتھ سے مجھ پر جو گزرا ہارون ہوتا تو اس پر گراں گزرتا۔ طاہر نے جو کچھ کیا اگر تیرے حکم پر کیا تو مقدر پر میں صبر کرتی ہوں۔''

مامون کو یہ خط ملا اور اس نے یہ اشعار پڑھے تو وہ

بے اختیار رو پڑا اور کہا'' واللہ میں خود اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لوں گا۔''

بدلہ تو اس نے نہ لیا مگر جب تک ملکہ زبیدہ جیتی رہی مامون الرشید نے اسکا اعزاز واکرام برقرار رکھا۔ اس نیک دل خاتون نے یکم جمادی الاول کو بغداد میں وفات پائی۔

(استفادہ: تاریخ اسلام کی چارسو باکمال خواتین از طالب ہاشمی، خواتین اسلام کے کارنامے ازمولانا ذوالفقار احمد نقشبندی، جنٹل مین اللہ اللہ از کرنل اشفاق حسین، بتول فائل)

☆☆☆

شاہدہ اکرام

خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

ہر گرنے والے پتے کی جگہ نئے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔مگر سردیوں کی یخ راتوں میں مَیں ہوتی ہوں اور تمہاری جان لیوا یاد.....ایک تڑپتی تحریر

یہ جنوری2013ء ہے۔ حفصہ! تمہیں مجھ سے بچھڑے ایک سال کا عرصہ بھی گزر گیا365دن بیت گئے.....ابھی تو کل کی بات ہے۔نانا ابا کے گھر میں وہ کمرہ بقعہ نور بنا ہوا تھا جس میں تم نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ بڑی بھابھی دیکھنے آئیں تو بولیں بچی کا تو واضح پتہ نہیں چل رہا بس کوئی سفید سفید روئی کے گالے جیسی چیز پڑی ہے۔گول مٹول نہایت خوبصورت سرخ وسفید رنگت والی بچی کو ہر کوئی پیار کر رہا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ تم نے کھانا پینا، بولنا اور چلنا سیکھ لیا،تم اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں دو بہنیں اور ایک بھائی تم سے بڑے تھے۔ میں تمہاری ماں تمہیں دیکھ کر بعض اوقات حیرت میں ڈوب جاتی۔ ہم عمر بچوں والی تم میں کوئی بات بھی نہ تھی۔تم انتہائی صبر والی بچی تھیں۔دودھ پلائے کئی کئی گھنٹے بھی گزر جاتے تو تمہاری طرف سے کوئی احتجاج ہوتا نہ چیخ وپکار۔تم نے مجھے بالکل نہیں ستایا۔تم دو تین سال کی عمر میں ہی دیکھنے والوں کو بہت بردبار، باوقار، سنجیدہ، متین اور ذہین نظر آئیں اور میں ہر وقت تمہاری نظر اتارتی رہتی۔

تم رب کو بھی شروع سے ہی بہت محبوب تھیں۔ ابھی تین سال کی بھی نہیں ہوئی تھیں کہ ایک دن باہر دروازہ کھلا دیکھ کر باہر نکل گئیں۔گھر والوں کو مہمانوں کی آمد کی وجہ سے بالکل نہ پتہ چلا تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجی تو میں دروازے پر گئی۔ ہمارے ہمسائے کا آدمی تمہاری انگلی پکڑے کھڑا تھا اور بتا رہا تھا کہ وہ گھر سے کافی دور بڑی سڑک کے پاس سے تمہیں اٹھا کر لایا ہے۔ یوں ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

جب تم سات سال کی ہوئیں تو میں نے رکنیت کا حلف اٹھایا۔ اس سے پہلے پانچ سال تم میری تمام مصروفیات میں میرے ساتھ رہیں۔تم تو مجھ سے کبھی جدا ہی نہیں ہوتی تھیں۔ ہر وقت میرے ساتھ رہنا تمہارا محبوب مشغلہ تھا۔تمہیں میری ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔

سکول میں بھی تم نے اپنی کوئی خاص سہیلی نہ بنائی تمہاری دوستی میرے ساتھ ہی تھی۔تم تو چھوٹی عمر سے

ہی اپنی ہر چیز بہت طریقہ سلیقہ سے رکھنے کی عادی تھیں۔تم سب کچھ خود بخود سیکھ رہی تھیں۔ دوسروں کو خاموشی سے دیکھنا اور کر گزرنا۔ میں نے تمہیں ہاتھ پکڑ کر لکھنا سکھایا، تختیاں لکھوائیں، سبق یاد کرائے، میرے علاوہ تمہیں کسی سے کام کروانا اچھا نہ لگتا تھا، اپنی منفرد عادات اور خصوصیات کے ساتھ تم بڑی ہوتی گئیں۔

تمہارا تجزیہ بہت زبردست تھا۔ ہر چیز کو بہت غور وخوض سے دیکھنا اور ہر کام کو بہت طریقہ اور سلیقہ سے کرنا تمہاری فطرت میں شامل تھا۔ میرے تحریکی کاموں میں تم ہمیشہ میرے ساتھ رہتیں سفر حضر اکھٹے کیا۔ میری ایک ایک حرکت کو دیکھتیں اور پھر اپنے عمل میں سمو لیتیں تم نے بہت چھوٹی عمر میں دین کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اب تم نے اپنی سہیلیاں بنانا بھی شروع کر دیں۔ ''بزم گل'' کی تمہیں نگران یونٹ بنا دیا گیا۔ تمہیں یاد ہے نا ہم نشتر ہسپتال میں رہ رہے تھے وہ تمہارا حلقہ بن گیا۔ کہانیاں اور بچوں کے رسالوں کا تمہارے پاس سٹاک ہوتا اس کا بک سٹال لگا لیتیں بچیوں کو دعوت نامہ لکھ کر بلاتیں اور اس میں خاص طور پر لکھتیں کہ اپنی اعانت دو روپے لیکر آئیں اور کتابیں خریدنے کے لئے پیسے بھی ساتھ لائیں۔ جس دن پروگروم ہوتا تمہاری خوشی دیدنی ہوتی۔ اپنے ابو سے بچیوں کے کھانے کی چیزیں منگوانا، پلیٹوں میں ڈال کر رکھنا، گرمیوں میں شربت بنا کر رکھنا، سردیوں میں چائے بنانا، بیٹھنے کا انتظام کرنا، پروگرام کی تیاری کرنا غرض ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھ سے کرنا تمہیں بہت بھلا لگتا تھا۔ کسی دوسرے کو تکلیف دینا تمہارا شیوہ نہ تھا۔ بہت خوش اسلوبی سے پروگرام نمٹا کر بعد میں ساری چیزوں کو جلدی جلدی سمیٹ کر جگہ کو صاف ستھرا کر دینا تا کہ مجھے تکلیف نہ ہو اور نہ ہی کوئی کام کرنا پڑے۔

تمہارا میرے ساتھ وابستگی کا عالم یوں تھا کہ میری ہر سانس کے ساتھ تمہاری سانس ہوتی تھی۔ سکول میں بھی تم اپنی ہر کلاس میں فرسٹ آئیں۔ بھائی کے ساتھ تم نے بھی قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ آخری تین پارے حفظ کیے۔ بچیوں کا علیحدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں ہٹانا پڑا۔ تم ہر کام کو بہت اچھے طریقے سے لکھ کر کرنے کی عادی تھیں، ہر کام کی علیحدہ علیحدہ ڈائریاں بنائی ہوتی تھیں۔ لڑکپن میں بھی تم نے آمد وخرچ کا سارا حساب سنبھال لیا تھا۔

تم بہت چھوٹی سی تھیں ڈیڑھ سال کی عمر کی ہوگی۔

تم نے نیا نیا بولنا سیکھا تھا اور ایک فقرہ تم بہت کہتی تھیں۔ ''یہ کیا ہے؟'' جب بھی کوئی چیز تمہیں نظر آتی تو تم یہ فقرہ کہنا شروع کر دیتیں۔ جس سے ہمیں سمجھ آ جاتی تھی کہ تمہارے قریب کوئی نہ کوئی چیز ہے۔ ایک دفعہ گرمیوں کی دوپہر میں سب لوگ چارپائیوں پر لیٹے سونے کی تیاری کر رہے تھے اور تم نیچے فرش پر کھیل رہی تھیں کہ مجھے تمہاری آواز نے چونکا دیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں فوراً اٹھی اور تمہیں اٹھا کر چارپائی پر بٹھایا اور جوتا لیکر کافی بڑے بچھو کو مارا جو آگے آگے تھا اور تم اس کے پیچھے پیچھے اپنی سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اس کے قریب کر کے کہہ رہی تھیں ''یہ کیا ہے؟'' اور وہ بڑے آرام سے آگے آگے چل رہا تھا، خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سچ ہے جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

تم نے ہمیشہ ساتر لباس پہنا۔ دو سال کے بعد جانگیہ فراک نہیں پہنے، سر کبھی ننگا نہ رکھا۔ ہمیشہ سکارف استعمال کیا۔ پاجامہ، شلوار پہنا، تم بہت خوش لباس تھیں۔ 80 کی دھائی میں تم پرائمری کلاس میں تھیں اور ساتھ ہی ''بزم گل'' بچوں کی تنظیم سے منسلک اس کے سارے مطالبات اور تقاضے پورے کرتے ہوئے تم کتنی خوش ہوتیں۔ 90 کی دھائی میں تمہاری ہائی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔ بزم گل کی بڑی ذمہ داری دے دی گئی۔ پورے دعوتی یونٹ کی نگراں بنا دیا گیا۔ تم نے بہت خوش اسلوبی سے اس کو نبھایا تم نے اسکول میں بھی یہی کام شروع کر دیا اور خاندان کے اندر بھی تمہارا مضبوط رابطہ تھا۔ کزنز کے ساتھ خط و کتابت، ان کو تحائف دینا، مطالعہ کیلئے رہنمائی اور اعانت لینا، یہ سب کام تم بہت آسانی سے کر لیتی تھیں۔ تمہیں کچھ بھی مشکل نہ لگتا۔

تم نے فضول گوئی کی نہ کسی فضول کام میں حصہ لیا۔ اسلامی کتب سے تمہیں انتہائی لگاؤ تھا۔ کتابوں کو سنبھال کر رکھنا تمہارا پسندیدہ کام تھا۔ میرے پاس ڈویژنل ذمہ داری تھی۔ میرے سارے حسابات تم نے ہی رکھے ہوتے تھے۔

گھر کی صفائی ستھرائی سے تمہیں شغف تھا۔ جو کام دوسری بچیوں کو مشکل لگتا وہ تم بخوشی کر لیتی تھیں۔ تمہیں اپنے سے بڑے بھائی سے بہت انس تھا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے کوئی کام خاص طور پر تمہیں سکھایا ہو تم تو دیکھ کر خود بخود ہی سیکھ لیتی تھیں۔ اپنے ابو کا خاص طور پر خیال رہتا۔

تم بچپن سے ہی نماز کی پابند تھیں۔تمہارے ابوتو تکبیر تحریمہ کے حریص ہیں لیکن تمہیں ان سے زیادہ انکی نماز کی فکر ہوتی تھی۔ اگر کبھی بھولے سے وہ ذرا ستانے کے لئے لیٹ جاتے تو تمہاری جان پر بن جاتی ''ابو جی! اٹھیں نماز کا وقت ہوگیا۔ابو جی! جماعت میں تھوڑا وقت ہے ابو جی! ابو جی!'' تم ان کو اٹھا کر دم لیتیں اور جب وہ وضو کر کے مسجد کا رخ کرتے تم اطمینان کا سانس لیتیں۔

تم نے میٹرک تک فرسٹ پوزیشن لی۔ پھر ایم اے تک فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔تمہارے بڑے بہن بھائی گولڈ میڈلسٹ ہیں، میری تمنا تھی کہ تم ان سے آگے بڑھ جاؤ۔ حفصہ! تم واقعی ان سے آگے بڑھ گئیں۔تم ایف اے میں اسلامی جمعیت طالبات کی کالج کی ناظمہ بن گئیں۔ وہاں بھی تم نے مثالیں قائم کیں۔تم نے تحریک میں آنکھ کھولی۔تحریک ہی تمہارا اوڑھنا بچھونا تھی تم نے تحریک کو حقیقت میں ایک خاندان سمجھا۔تم نے بے شمار تحریکی دوست بنائیں اور دوستی کو آخر تک نبھایا۔دوستوں کو دعوتوں پر بلایا، تحائف دیئے فون کیے، ہمیشہ یاد رکھا۔

میرے پاس صوبے کی ذمہ داری آگئی، ہزار کی دہائی شروع ہوگئی۔ دوروں میں تم میرے ساتھ ساتھ رہتیں۔میری بہت اچھی تیاری کرتیں۔میرا سفری بیگ بہت چاؤ سے تیار کرتیں۔ کپڑے استری کرنا، رکھنا، تمہیں ان کاموں سے دلی لگاؤ تھا۔ واپسی پر میرے بیگ کو کھولنا اور ہر چیز کو ٹھکانے پر رکھنا تمہاری ذمہ داری تھی۔تمہارا وقار مزید بڑھ گیا تھا۔ بزرگوں سے ادب واحترام سے ملنا تمہارا وطیرہ تھا۔تمہیں بیت المال کی ذمہ داری دی گئی۔ پکار کی ترسیل کی ذمہ دار بنایا گیا۔ معاون شہر بنیں۔یہ سارے کام تو تم نے رفیقہ بن کر کیے تا آنکہ تمہیں رکن بنالیا گیا اور پھر تم شہر کی ناظمہ بنادی گئیں۔تم نے اس دوران بہنوں کی شادیاں دیکھیں بھائی کی شادی کی خوشی دیکھی۔ بہنوں کے بچوں کو کھلایا۔ بچے تو تمہاری جان تھے۔ گندے مندے بچوں کو بھی اٹھا کر پیار کرنا تمہارا شوق تھا۔میرے پاس لے کر آتیں اور کہتیں ''امی! دیکھیں کتنا پیارا بچہ ہے۔'' تمہیں لکھنے لکھانے سے بھی دلچسپی تھی۔ مجھے لگتا تھا تم ابھی چھوٹی بچی ہو میں تمہیں کہتی حفصہ! جب تم کچھ لکھو تو مجھے دکھا دینا اور تم گھنٹوں کتابوں میں گم مطالعہ کرتی رہتیں اور میں اس وقت دیکھتی جب تمہارا بہت ٹھوس اور مدلل مضمون اخبار کے صفحہ کی زینت بن چکا ہوتا۔تم نے

شاعری کی بھی کوشش کی جس میں موت اور قبر کا بھی ذکر ہوتا۔ تمہارا انتخاب بھی ایسا ہی تھا۔ رب اور رب سے ملاقات کا ذکر نمایاں ہوتا۔ جانے والوں کی یاد میں اشعار بھی ایسے ہی ہوتے۔ تمہیں بچوں کی کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ تمہاری یہ کوشش بھی جاری رہتی۔

تم بہت باذوق تھیں ہر چیز بہت اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کرتی۔ اپنی ہر چیز کو بہت سجا کر رکھنا تمہیں عزیز تھا۔ وقت کی پابندی تمہارا خاصہ تھی۔ خاص طور پر اول وقت نماز پڑھنا تمہاری خصوصیت تھی تم نے کسی کی کبھی غیبت نہیں کی۔ بہت دلسوزی سے دوسروں کی تربیت کے لئے پریشان رہنا تمہاری عادت تھی تمہارا اپنے رب کے ساتھ بہت محبت والا خصوصی تعلق تھا اسی لئے تو حفصہ! آخر وقت تمہارے لبوں پر اللہ کا ہی نام تھا۔

حفصہ! تم علم و عمل میں سارے گھر سے آگے نکل گئیں۔ تم نے بی اے کے ساتھ ساتھ وفاق کے تحت قرآن مجید عربی گرائمر اور لفظی ترجمہ کے ہمراہ مکمل کیا۔ جمعیت طالبات کی طرف سے عربی گرائمر اور قرآن کے ترجمہ کے دو دفعہ ٹیسٹ ہوئے دونوں دفعہ تم سو فی صد نمبر لیکر پاکستان بھر میں اول ٹھہریں۔ حدیث کا کورس مکمل کیا۔ وفاق کا امتحان دیا اور سند یافتہ ٹھہریں۔ تم نے وہ ڈگری بھی حاصل کر لی جو تمہارے دوسرے بہن بھائی حاصل نہ کر سکے۔

تم ان سے آگے نکل گئیں۔ اور تم تو ویسے بھی آگے ہی نکل گئیں تمہارے قرآن پاک مکمل کرنے پر اور سند ملنے پر ہم نے پارٹی کی۔ تم بہت خوش تھیں۔ ایف اے اور بی اے میں فرسٹ پوزیشن لینے پر پارٹی دی۔ ایم اے کے بعد پارٹی دی۔ میری دوسری بیٹیاں لاڈ سے کہتیں، کیوں امی افشی زیادہ لاڈلی ہے؟ اور میں جواب دیتی یہ چھوٹی ہے تمہارے بچوں کی طرح ہے۔

میری پیاری بیٹی! میں نے تیرے لئے رب سے جو مانگا اس نے بڑھ کر دیا۔ تمہارے بارے میں میری ہر خواہش پوری کی۔ میرا وہ خواب بھی رب نے پورا کیا کہ میں نے تمہیں سرخ عروسی جوڑے میں رخصت کیا۔ تمہیں رب نے بہت اچھا سسرال دیا۔ بہت محبت کرنے والے شوہر سے نوازا۔ میرا دل اور آنکھیں رب نے ٹھنڈی کیں اور تم مارچ 2008ء میں پیا دیس سدھار گئیں۔ وہاں تین سال کے عرصہ میں سب کے دل اپنی مٹھی میں لے لئے۔ شوہر کی پسند ناپسند کا انتہائی خیال رکھا۔ شرعی پردہ کیا۔ قرآنی کلاسز کا آغاز کیا۔ تین رمضان دورۂ قرآن کرائے۔ تحفے تحائف دیکر سب

کے دل موہ لئے۔ کیا نوجوان لڑکیاں کیا بزرگ عورتیں اور کیا ہم عصر سب سے دلی دوستی کی۔ سب کی دعائیں لیں۔

رب نے بیٹے کی شکل میں نعمت عطا فرمائی۔ اس کے بعد جو صحت بگڑی تو سنبھلنے میں نہ آئی۔ آخر دم تک پردہ اور نماز کا خیال رکھا۔ آخری دن بھی پوری نمازیں پڑھیں اور جمعہ کا دن گزار کر ہفتہ کی رات 28 جنوری 2012ء تہجد کے وقت اللہ اللہ کرتے اللہ کے پاس چلی گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حفصہ میری بچی! میں تجھے اللہ کے حوالے کرتی ہوں..... اس ہستی کے حوالے جس کے پاس کوئی امانت ضائع نہیں ہوتی۔ میں اس کی رضا پر راضی ہوں۔ لیکن میں سنت رسولؐ اللہ کے مطابق اتنا کہنے کا تو حق رکھتی ہوں کہ اے اللہ! میں حفصہ کی جدائی پر غمزدہ ہوں اور پیارے رسولؐ کے الفاظ ہی دہراتی ہوں۔

''آنکھیں آنسو بہاتی ہیں دل روتا ہے مگر زبان وہی کہے گی جو میرے رب کو پسند ہے۔''

حفصہ! آخری دو تین ماہ تو تمہاری زندگی میں انتہا درجہ کا خشوع وخضوع آ گیا تھا۔ تم نے خلاف معمول بہت اونچی آواز میں قرآن کے مخارج کی صحیح ادائیگی کے ساتھ تلاوت شروع کر دی۔ دعاؤں اور سورتوں کے حفظ کا بہت اہتمام شروع کر دیا تھا اور تمہارا یہ معمول بن گیا تھا کہ تم سردیوں کی راتوں میں ساڑھے تین، چار بجے اٹھتیں تہجد کی نماز کے بعد ذکر اذکار وتسبیحات میں مصروف ہو جاتیں تا آنکہ فجر کی اذان ہو جاتی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن کرنا تمہارا معمول تھا اس کے بعد تم لیٹ جاتیں۔ پھر اٹھ کر ناشتہ کرتیں۔ مجھے صبح کو اٹھانا بھی تمہارے ہی ذمہ ہوتا تھا۔ جب تک میں اٹھ کر باتھ روم میں نہ چلی جاتی تم مسلسل اٹھانے کا کام کرتی رہتی۔ تم میری بھی محاسب اور نگران تھیں جوانی میں درویش تھیں۔

حفصہ! تم اپنی زندگی دین وایمان کے مطابق گزار کر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ قول وعمل سے ادا کر کے اپنے ابدی گھر روانہ ہو گئیں۔ تمہیں بچپن سے سچائی سے عشق تھا تمہیں مذاق میں بھی جھوٹ ناگوار گزرتا تھا تم سختی سے اس پر کاربند تھیں۔ تمہاری ڈائریوں میں سچے رب اور سچے گھر کے تذکرے ہیں تم نے خود کو ایک مسافر ہی سمجھا تھا اور بہت صبر سے تمام تکالیف برداشت کر گئیں تمہارا سفر تمام ہوا تم بہت خوبصورت

زندگی گزار کر رخصت ہو گئیں۔ جمعہ تمہارا آخری دن تھا۔ اس دن میں نے تمہیں، تمہارے بے حد اصرار پر سرخ جوڑا پہنایا تھا۔ میری نظریں تم پر نہیں ٹک رہی تھیں میں نے فوراً ماشاء اللہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھنا شروع کر دیا۔

حفصہ! تم اس وقت شادی والے دن سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھیں تم پر روپ کی بہار آئی ہوئی تھی۔ نہلاتے ہوئے ایک بہن میرے پاس آئیں اور انہوں نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا باجی! حفصہ کا رنگ اتنا سفید کیوں ہے؟ میری بہن کا خیال تھا کہ شاید کسی بیماری کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ حفصہ کا یہ قدرتی رنگ ہے سر سے پیر تک یک رنگی۔ وہ ویسے بھی صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی تھی نہلانے کے بعد چارپائی پر لٹانے کی باری آئی۔ تحریکی خواتین گواہی دے رہی تھیں کہ خدا کی قسم باجی! حفصہ کا تو وزن ہی نہیں تھا وہ بہت ہلکی پھلکی تھی۔ دفنانے کے مراحل طے کر کے میرا شوہر اور بیٹا جب واپس آئے تو میں نے اپنے اکلوتے بیٹے سے سوال کیا، صہیب! حفصہ کو کس نے لحد میں اتارا؟ وہ بولا امی! میں نے۔ میں نے کہا صہیب! یہ کتنا مشکل کام ہے۔ میرے شوہر بولے کیوں مشکل کیوں ہے۔ حفصہ کے شوہر نے اٹھا کر میت کو لحد میں کھڑے صہیب کو پکڑا دیا اور اس نے دفنا دیا۔ میں رو پڑی۔ میرا بیٹا میرا مدعا سمجھ گیا۔ بولا امی! میں نے جب حفصہ کو ہاتھوں میں اٹھایا تو اس کا تو وزن ہی نہیں تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

اس کے آخری دیدار کے موقع پر خواتین حیران تھیں انتہائی پرسکون چہرہ اور خوبصورت و چمکدار اتنا جیسے شبنم کے موتی جڑے ہوں۔ رنگ سرخ و سفید، اتنا سفید جیسے چاند کی چاندنی یا دودھیا رنگت۔ مجھے وہ کمرہ یاد آ رہا تھا جس میں پہلے دن حفصہ تم نے آنکھ کھولی تھی اور وہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ میرے لئے جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے شب و روز بہت مشکل گزرتے ہیں۔ میں تمہاری جدائی میں اپنے رب کے آگے گریہ کرتی ہوں اللھم اشکوبثی وحزنی الی اللہ ! میرا بیٹا! مجھے تسلی دیتا ہے کہتا ہے۔ امی! آپ کیا سمجھتی ہیں حفصہ کی زندگی ختم ہو گئی ہے، نہیں امی نہیں! اس کی زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ حفصہ کا شوہر بہت دین دار آدمی ہے وہ سمجھاتا ہے۔ آنٹی! کیا آپ اس پر خوش نہیں ہیں کہ وہ یہاں سے زیادہ وہاں خوش ہے وہ اعتراف کرتا ہے۔ آنٹی وہ ولی اللہ تھی۔ اور میں شکر ادا

کرتی ہوں کہ اللہ نے تمہارے حق میں یہ گواہیاں زبان سے نکلوائی ہیں۔ اللہ میں تیرے فیصلے پر دل وجان سے راضی ہوں۔ میری بیٹی کو تجھ سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا اس نے کبھی بھی زبان کا فضول اور غلط استعمال نہ کیا۔ نپی تلی مختصر اور مدلل بات کرتی تھی۔ اللہ اس کی نیکیوں کو قبول فرمالینا۔

اس کی دوستیں بھی اسکی گواہی دیتی ہیں۔ کوئی کہتی ہے کہ ہمیں حفصہ باجی نے تفسیر پڑھنی سکھائی، کسی کو عملی اصول کیسے نکالے اور لئے جاتے ہیں وہ یاد ہیں۔ کوئی خطوط کا تذکرہ کرتی ہیں تو کوئی تحفہ میں دی ہوئی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر تمہیں یاد کرتی ہیں۔ اللہ! ان سب چیزوں کو تمہارے لئے صدقہ جاریہ بنادے۔ حفصہ! تم اپنی کم گوئی اور سنجیدگی کی وجہ سے نہیں بلکہ ہم ذوق نہ ملنے کی وجہ سے سہیلیاں نہ بنا سکی تھیں مگر جیسے ہی تم نے دین کا شعور حاصل کیا پورے پاکستان میں تمہاری دوستیاں پھیل گئیں۔ تم جمعیت کی سہیلیوں میں بہت خوش ذوق مشہور تھیں۔ اللہ تمہارے تمام حسنات کو قبول فرمالے اور تمہارے بیٹے کو تمہارے لئے صدقہ جاریہ بنادے اور ہمیں بھی تمہارے جیسی دین سے وابستگی عطا فرمائے۔

حفصہ! تم بزرگوں سے دعائیں لینے کی بھی حریص رہتی تھیں۔ تمہاری ڈائری بزرگ تحریکی خواتین اور تحریکی دوستوں کے آٹوگراف سے بھری پڑی ہے۔

حفصہ! تمہیں مجاہدین سے بہت انس تھا۔ تم میرے ساتھ کشمیر بھی گئیں آکر تم نے پورا سفرنامہ لکھا۔ سید صلاح الدین سے تم نے آٹوگراف لیا۔ تم نے یہ روداد تمام کزنز کو خطوط میں لکھی۔ شہدائے اسلام کی تصاویر کا البم بنایا جو شادی کے موقع پر میں نے تم سے لیکر اپنے پاس رکھا۔ اللہ وہاں بھی تمہیں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت نصیب فرمائے۔ تم یہاں بھی ان کے ہم رکاب ہی رہتی تھیں۔

حفصہ! تمہاری بہنیں، تمہارا اکلوتا بھائی، تمہارے ابو اور میں تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ہر وقت تمہاری خوبیوں کا چرچا رہتا ہے، تمہاری منجھلی بہن سعدیہ اپنی بچیوں کو تمہارے طریقہ اور سلیقہ کی مثالیں دے دیکر تربیت کرتی ہیں۔

تمہاری کتابوں سے ہمارا گھر آباد ہے۔ میں نے تمہارے نام وقاص ٹاؤن میں ایک لائبریری کا قیام کیا ہے۔ انشاء اللہ میرا رب ضرور تمہیں اس کا اجر پہنچائے گا۔ تمہارے بہت عزیز بھانجے، بھانجیاں

تمہارے لئے کوئی نہ کوئی صدقہ جاریہ کا کام کرتے رہتے ہیں۔تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔

حفصہ! ہم سب کی طرف سے تمہارے حقوق ادا کرنے میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔

حفصہ! میں اگر ایک پل بھی تمہیں نظر نہ آتی تو تم بہت بے چین ہو جاتیں اور گھبرا کر پوچھتی امی کہاں ہیں؟ امی کی چارپائی کہاں ہے؟ امی کہاں بیٹھی ہیں؟ امی کہاں سوئیں گی؟ وغیرہ۔اور جب تک مجھے دیکھ نہ لیتیں تمہیں چین نہ آتا۔تمہارا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا میرے ساتھ ہوتا اس معاملہ میں تمہیں کسی کے مذاق کی بھی کوئی پروانہ ہوتی۔اب مجھے تمہاری جدائی غمزدہ تو کرتی ہے لیکن میں مطمئن ہوں حفصہ بلکہ بہت خوش ہوں کہ تم رب کی فرمانبرداری کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئی ہو اور اب تم مجھ سے ستر گنا زیادہ مہربان ہستی کی گود میں چلی گئی ہو میرے رب نے جب تک تمہیں میرے پاس رکھنا مناسب سمجھا رکھا اور جب اس کو لگا کہ میں خدشات کا شکار ہو گئی ہوں اور تمہاری اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتی تو تمہارا، تم سے محبت کرنے والا رب تمہیں اپنے پاس لے گیا۔

حفصہ! بدلتی رت کا سماں ہے پت جھڑ کا موسم ہے میں گرتے ہوئے پتوں کو دیکھتی رہتی ہوں ہر گرنے والے پتے پر نئے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔سردیوں کی یخ راتیں ہیں میں ہوتی اور تمہاری یاد ہوتی ہے۔ایک سال گزر گیا ہے وقت پر لگا کر اڑ رہا ہے، ہمارا درمیانی وقفہ کم ہو رہا ہے۔تمہارا پہلا اور آخری دن میری یادوں کے چوکھٹے میں جڑ گیا ہے۔بس اتنی سی بات ہے، ابھی کان میں اذان دی گئی تھی ابھی آخری نماز سے لوگ فارغ ہوئے ہیں پلک جھپکنے کی بات ہے ہم ادھر سے ادھر منتقل ہو جائیں گے۔سب دوریاں ختم ہو جائیں گی۔رب ایمان پر خاتمہ کر دے۔انشاء اللہ جلد ملاقات ہو گی۔اللہ حافظ۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے پائندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

☆☆☆

میری لائبریری سے

نام کتاب: چراغوں کا دھواں

مصنفہ: نیر بانو

قیمت: ۲۰۰/- روپے

پیارے قارئین السلام علیکم! کچھ ماہ کے لیے اس کالم میں توقف آ گیا۔ اس عرصہ میں کتابوں کا ایک ڈھیر ہے جو کالم کے لیے للچائی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ سردست جو کتاب منتخب کی گئی ہے یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے۔

کہتے ہیں کہ کچھ بیان جادو ہوتے ہیں۔ محترمہ نیر بانو صاحبہ جو اسلامی ادب میں ایک ''ادب مینارے'' بلکہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں کی تحریر بھی پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ استعارے، محاورے، ضرب الامثال اور نادر تشبیہات کے علاوہ ان کا قلم ماضی کی سیر میں خاصا ہنر رکھتا ہے، یادِ ماضی کو عذاب ہے یارب کہنے والوں کے لیے یہ کتاب منہ توڑ جواب ہے جو اپنے اندر ماضی کا وہ سنہرا دور رکھتی ہے جہاں پر ادب آداب، اخلاقیات کا بول بالا ہے۔ گفتگو سے لے کر رسم ورواج میں یہ ادب واحترام ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے...... کتاب نیر بانو صاحبہ نے اپنے آباو اجداد کی یاد میں لکھی ہے لیکن یہ یادیں ایسی چمکتی دمکتی ہیں کہ موجودہ تہذیب ''مردہ تہذیب'' لگتی ہے...... چھوٹی چھوٹی رسمیں، لین دین، برت برتاؤ میں قیام پاکستان سے قبل کے برصغیر کے حالات دل موہ لینے والے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

محترمہ نیر بانو صاحبہ نے اپنا بچپن بھی ''منی'' کے بچپن میں پیش کیا ہے جسے پڑھ کر بے ساختہ ذہن گواہی دیتا ہے کہ بڑے لوگوں کی بنیاد بچپن میں ہی بڑوں والی ہوتی ہے۔

نیر بانو صاحبہ کا تعلق معروف دانشور اور مصنف جناب خرم جاہ مراد اور سٹیٹ بنک کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین (جسٹس ناصر اسلم زاہد صاحب کے والد) کے خاندان سے ہے۔ یہ خاندان اپنی اقدار میں اپنی مثال آپ تھا ...... محترمہ نیر بانو صاحبہ کا قلم اپنے خاندان کی روایات کا ذکر کرتے ہوئے اک سماں سا

باندھ دیتا ہے ..... آیئے کچھ مناظر کی طرف متوجہ ہوں۔

کتاب کے آغاز میں محترمہ نیر بانو صاحبہ نے اپنے بارے میں بھی لکھا ہے۔ جماعت سے اپنے پہلے تعارف اور رکنیت فارم کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

''گوہر گنج والے گھر کا صحن بہت بڑا تھا۔...میری بچی تین چار ماہی عمر میں بہت رونی تھی، اس نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میں بھی نئی نئی ماں بنی تھی اور ناتجربہ کار تھی۔ میری خالہ کے دس بچے تھے اور گھر میں کوئی شور ہنگامہ نہیں تھا اور ان کا چھوٹا بچہ میری بچی سے صرف ایک ہفتہ بڑا تھا۔ جسمانی تھکن اور ذہنی بے آرامی کو سکون دینے کے لیے مجھے کچھ پڑھنے کو چاہیئے ہوتا تھا۔ کتاب اخبار رسالہ کچھ بھی ہو۔ میری تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن پڑھنے کے شوق نے اس کمی کو قابو کر لیا تھا۔ آرام سے انگلش کلاسیکل ادب پڑھ لیتی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی فرسٹ ائیر میں رہتک میں داخل ہوا تو جو کتابیں کالج لائبریری سے اپنے لیے نکلواتا وہ مجھے پکڑا دیتا اور میں آرام سے گھر میں پڑھ لیتی۔ اسی مطالعہ کے نشے کے کارن میں نے خالہ سے کتاب مانگی وہ بولیں ''ہماری کتابیں تمہیں کیا پسند آئیں گی؟'' میں نے جواب میں کہا ''جیسی بھی ہیں آپ دیں تو سہی'' انہوں نے کہا ''فلاں کمرے میں جاؤ، گھومنے والی الماری میں کتابیں ہیں جو پسند آئے تو لے لو.....'' عجیب بھاری بھاری خشک موضوعات پر کتابیں تھیں۔ ملکی ماحول کے اثر سے ہمارے ہاں پردہ کی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ ایک کتاب پر عنوان ''پردہ'' تھا تھک ہار کے وہی اٹھا لی .....اس کتاب نے میرے دل و دماغ کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ پھر اس مطالعہ کا اثر تھا کہ دل و دماغ کا سارا میل کچیل دھل دھلا گیا۔ سارا کاٹ کباڑ چھٹ گیا۔ مجھے لگا میں آج پیدا ہوئی ہوں، اور میں نے پہلا سانس آج لیا ہے۔

فجر کے وقت نہا دھو کر نماز پڑھی۔ کلام الٰہی سامنے رکھ کر جماعت کی رکنیت کا حلف بھرا۔ اللہ خالق اِنس و جان، مالک بحر و بر کی ذات میری گواہ تھی۔ دفتری فارم کب بھرایا کس نے بھروایا یہ مجھے یاد نہیں۔ جب جذبات میں تہلکے پڑ رہے ہوں اس دل کی دنیا زیروزبر ہو، ربّ العالمین۔ الرحمٰن الرحیم سے معاملہ ہو۔ اس وقت کہاں ہوش قائم رہتے ہیں۔ رجسٹروں اور فارموں کی باتیں تو بعد میں ہیں.....''

آ گے چل کر مصنفہ لکھتی ہیں یہ یادیں میری ذات کا تسلسل ہیں میری ہستی کا اثبات ہیں جو گزر چکے اور جو آنے والے ہیں ان کی درمیانی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔

محترمہ زبیدہ بلوچ صاحبہ کے سوالنامے کے جواب میں نیر بانو صاحبہ نے اپنی تاریخ پیدائش ۸/ اگست ۱۹۱۷ء لکھی ہے جس کا مطلب ہے انھوں نے اپنا بچپن اور جوانی برصغیر میں گزاری۔

''بی بی اللہ رکھی کے عنوان سے باب میں اپنی نانی کا تعارف ملاحظہ کریں۔

''میرے روبرو میری اپنی نانی اماں کا سراپا ہے۔ ان کے پاس دنیا ایک بارش کے قطرے کے برابر نہ تھی، البتہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور یقین کا سمندر پہلو میں تھا۔''

آ گے لکھتی ہیں:

''تنہا آدم خود بھی خوش اور مطمئن نہ تھے۔ نسل انسانی کے لیے ماں کا وجود گویا ضروری ٹھہرا، اس وقت ہمارے پیش نظر مسئلہ ہے عظیم ماؤں کا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کی بچیاں کل کی مائیں۔ ماؤں کا مرتبہ تو ہر عورت کو ایک نہ ایک دن حاصل ہو جاتا ہے، لیکن ماں کی حقیقی عظمت ہر کسی کو حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے بڑی محنت، ہمت، حوصلہ، بے نفسی، قربانی درکار ہوتی ہے۔ جس ماں میں یہ حوصلہ ہو کہ اپنی ذات اور خواہشات کی نفی کر سکتی ہو یا کرنا سیکھ لے، وہی سچی مامتا کی عظمت کی منڈیر پر پہنچ سکتی ہے..... جیسے کہتے ہیں کہ تک بندی تو سب کر لیتے ہیں، مگر اصلی شاعر کوئی کوئی ہوتا ہے۔ اسی طرح لڑکیاں اپنے وقت پر ماؤں کے روپ میں تو داخل ہو جاتی ہیں، لیکن سچی اور کھری ماں کا رُتبہ حاصل کرنا ہر ایک کو آسان نہیں ہوتا۔ اپنی جان مٹی میں ملا کر اپنی خواہشوں اور شوق پر تالے ڈال کر تب کہیں سچی مادریت کے حق کی ادائیگی کا امکان سامنے آتا ہے!! اور غور کرنے پر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح ماں کا جسم مختلف قسم کی تبدیلیوں اور تغیرات کو قبول کرتا ہے اور ان سے گزرتا ہے اسی طرح ماں کی نفسیات بھی یقیناً مختلف کیفیتوں سے گزر کر ماں کا دل، ماں کی نفسیات اور ماں کے عمل میں ڈھلتی ہے۔''

..... قارئین اس پیراگراف کی تمہید اتنی لمبی کیوں باندھی؟؟ اس لیے کہ بعض اوقات ماں بنے

بغیر مادریت کی تسکین کسی بہن بھائی کا بچہ گود میں لینے سے ہو جاتی ہے..... چونکہ نیر بانو کی دادی ''ماں جی'' بے اولاد تھیں لہٰذا بچہ گود لے لیا۔

لکھتی ہیں:

''ماں جی کو بچوں سے بڑی محبت تھی بچہ کسی کا ہوتا وہ سائبان بن جاتیں ان کی گود بچوں کا گہوارہ ہوتا وہ بچوں کو کھلاتیں پلاتیں۔ ان کی پسندیدہ چیزیں منگاتیں، پکاتیں تیار کرتیں اور چھپا چھپا کے سنبھال کر رکھتیں۔''

قارئین اگر آپ بیتی میں ادبیت کی چاشنی موجود ہو تو تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے..... کئی دفعہ تو کتاب میں ایک فقرے پر ہی سوچتے سر دھنتے پہروں گزر جاتے.....۔

''میں سوچتی ہوں مادریت ایسی انوکھی دلکش فداکاری قربانی والی کیفیت کا نام ہے؟ کیا مادریب ہی کا دوسرا نام عشق و محبت ہے؟ خالق کی خالقیت کا ہلکا سا پرتو، ایک ننھا سا چھینٹا اس خاک کے پتلے میں اتنا حسن اور کشش بھر دیتا ہے، اتنی مٹھاس نسیم سحر جیسی مہک اور پاکیزگی عطا کرتا ہے بلکہ لب ریز کر دیتا ہے کہ پوری کائنات لہرا اٹھتی ہے رقص کرنے لگتی ہے رنگ اور روشنی سے بھر جاتی ہے.....''

اپنے بچپن کی ایک جھلک!

''محلّہ وار آبادیاں تھیں۔ ایک محلّہ شیخوں کا، ایک محلّہ سیدوں کا۔ کئی قومیں اور برادریاں تھیں۔ رنگڑھ، کمبوہ، راونت اور پٹھان مشہور تھے۔ کمونیاں سروں پر ٹوکرے رکھے صبح ہی صبح گھروں میں سبزی بیچنے آتی تھیں۔ ہم عورتوں سے واقف تھے اور وہ رتانیاں اور رنگھڑیاں کہلاتی تھیں جیسے پٹھانیاں اور شیخنیاں۔ برادری کے حوالہ سے ذکر ہوتا تھا نام کی ایسی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ عام میل جول کا رواج نہیں تھا۔ صرف اپنے رشتہ داروں تک آنا جانا رہتا تھا۔ دن کے وقت عورتوں کا باہر نکلنا اور آنا جانا ناپسندیدہ تھا، صرف بیاہ شادی میں دن کے وقت باہر نکلنا ہوتا وہ بھی پیدل نہیں، ڈولی میں یا یکہ تانگہ پر..... لیکن چاروں طرف پردہ باندھ کر یا پھر غمی کے موقع پر جب مجبوراً جانا پڑتا۔''

.....اگلے صفحہ پر موسمی سوغات کا تذکرہ:

''یہ زمینیں، یہ باغ، یہ کھیت بچوں کے لیے بہت ہی مزے کی چیزیں اگا کر بھیجتے۔ ہر موسم میں کوئی نہ کوئی تحفہ بچوں کے لیے پہنچتا۔ مکئی کا موسم آتے ہی

گھروں میں چھلیاں آ جاتیں۔ دن میں دس گیارہ بجے تازہ بھنی چھلیوں کے گرم گرم نرم میٹھے مزیدار دانے۔ جب چنے کا موسم آتا تو اکثر دوسرے تیسرے دن ہرے چنوں کا چھولیا بھوننے کی بہار لگتی۔ بڑے اور بچے سب ہولوں کے الاؤ کے گرد آ بیٹھتے۔ بھوبل میں سے ہولے چنتے اور کھاتے۔ ہاتھ انگلیاں ہونٹ کالے ہوتے رہتے۔ یہ بہار تو اپنے موسم پر ہوتی۔ لیکن جاڑا گرمی ہر موسم میں بچوں کا شام کا ناشتہ تازہ بھنے دانوں کا ہی ہوتا تھا۔ مکئی کی کھیلیں، مرمرے سب قسم کی چیزیں بدل بدل کر اپنے اپنے موسموں پر تیار ہوتیں۔ تیلی اور بھڑ بھونجے شام سے پہلے بھاڑ جھونکتے اور بھٹیاں گرم کرنا شروع کر دیتے۔ جن بچوں کو دانے بھنانے جانے کی اجازت نہ ملتی ان کے ملازم لڑکے لڑکیاں دانے بھنوا لاتے۔ اس ناشتہ میں ملازم بچے بچیاں بھی برابر کے حصہ دار ہوتے۔ اس زمانہ میں ملازموں کی دستیابی ایسا مشکل مسئلہ نہیں تھا جیسا آج کل ہے..... مائیں اکثر خود ہی بچوں کو جانے پہچانے گھروں میں رکھوا جاتیں۔ روٹی کپڑا اور ایک روپیہ مہینہ! ویسے وہاں کے بازار میں صبح شام کے ناشتوں کی الگ سے دکانیں بھی تھیں۔ صبح کے لیے حلوہ پوری، کباب پراٹھے، ابلے انڈے تیار ملتے شام کے لیے دہی بھلے، دہی پھلکیاں، دہی بوندی، پکوڑے اور پتوڑ ہوتے۔ سیخ کباب بھی بنتے تھے بڑے گھروں میں حلوائی یا کبابیے خوان سجا کر خود بھی پہنچ جاتے اور عام لوگوں کو ان کی دکانوں سے خریداری کرنا ہوتی۔ اس زمانے میں ہوٹل نہیں تھے بس ڈھابے اور تندور ہی تھے اصل میں بازار میں شرفا کا کھانا سخت معیوب تھا۔ سوائے حلوائی والی چیزوں یعنی مٹھائیاں، خشک حلوے، پوری، کچوری، دال بھاجی ، ترکاری وغیرہ۔ اچار، چٹنیاں، دال موٹھ شریف اور معزز خواتین ہر قسم کے کھانے پکانے کی ماہر ہوتی تھیں خواتین کا کھانا پکانے میں ماہر ہونا اعزاز تصور ہوتا تھا۔''

قارئین کھانے پکانے کا سلسلہ کاغذ کے کئی صفحات پر مشتمل ہے اب ایک جھلک رشتے ناطے طے کرنے کی۔

''ذرا دیر میں کمی نین بڑی بی بی کے پاس پہنچ گئی .....''

''بی بی تہاڈا سنیہا مل گیا تھا۔ مبارکاں ہون۔

اللہ بھاگ لاوے۔دسو خیر نال کی کرنا اے۔''

''اری متینے کی سگائی کی ہاں ہوگئی ہے۔ جا کے مٹھائی لا۔لڈو یا پیڑے جو بھی اچھی تازی ہو۔''

''کنی لے آواں۔سیر یا دو سیر؟''

''روپے کی تو بہت ہو جاوے گی دو سیر لے آ۔ آج تو ان دو گھروں میں بھیجنی ہے۔ یہ لے پیسے۔'' انھوں نے صندوقچی اپنے پاس کھسکائی۔ازار بند میں بندھی چابی سے چھوٹی صندوقچی کھولی اور چار آنے نکال کے کمی نین کے ہاتھ میں دیے۔مٹھائی آنے تک سینی اور نیا خوان پوش نکال لائیں اور تین رکابیاں اتنے میں کمی نین بھی مٹھائی لے کر پہنچ گئی۔ بی بی جی نے تھالیوں میں حصے ڈالے۔کمی بولی۔

''اک رکیبی (رکابی) میاں بشیر ہوراں دے، دو جی ڈاکٹر ہوراں دے، تیسری رکیبی منڈی والے ڈاکدار اں دے گھر لے جانی ہے۔''

نائن جس گھر میں لے جاتی گھر والے چیز لے لیتے اور خالی رکابی میں دو چار پیسے یا کچھ زیادہ مثلاً چھ آٹھ پیسے چھڑائی کے نام پر ڈال دیا کرتے تھے۔

بی نذیراں ان دنوں بیٹے کی سگائی کے شوق میں اونچی اڑانیں بھر رہی تھیں ان کے بس میں ہوتا تو سارے شہر میں سگائی کا ہنوتا بھجواتیں بڑا دل مچل رہا تھا۔ دل میں ارمانوں کے جوار بھاٹے اٹھ رہے ہوں پر بڑی ہمت مار کے بیٹھی تھیں۔''

قارئین اگلے دس پندرہ صفحات اسی سگائی کے ذکر سے منور ہیں۔اب کچھ سن گن بننے اوڑھنے کی لیں۔

''بڑی آسان زندگی تھی روز نہا نہا کے وقت ضائع کرنا کسی کو اچھا نہیں لگتا تھا جمعہ اور پیر کے دن نہانے کا رواج تھا۔ بی بی نے جلدی سے بغیر نہائے کپڑے بدلنے کا سوچا عنابی چھینٹ (پرنٹڈ لیلن کاٹن) کا تنگ سیدھا پاجامہ سفید ململ کا کلی دار کرتا، بادامی رنگا ہوا ململ کا دوپٹہ جس کے دونوں پلوؤں پر چار چار پلیٹیں پڑی تھیں اور بیل لگی تھی۔ دوپٹہ چنا ہو اتھا تنگ پاجامہ کی مہری کو ایڑی پر سے پنڈلی کی طرف چڑھانا جان جوکھوں اور مہارت فن کا کام ہوتا ہے۔

آخر کو بی بی جی نے کپڑے بدل لیے بندھی چوٹی پر ہی سامنے کے بالوں پر کنگھی پھیر کر پٹیاں جما کر درست کر لیں کانوں میں بالی پتے اور گلے میں چمپا کلی کبھی جگنی مالا ہر وقت پہنے ہوتیں۔''

کتاب میں گاہے بگاہے سینے پرونے اور پکانے اور ریندھنے کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔

کچھ بیان رشتہ داریوں کا..... جیسے ان وقتوں کی عمارتیں خوب کشادہ پھیلی ہوئی، ہوار دار چوڑے آثاروں اور مضبوط بنیادوں پر بنی ہوتی تھیں۔ ویسے ہی رشتہ داریوں کا معاملہ تھا۔ بہت مضبوط، خوب گہری، چوڑے آثاروں پر استوار، کشادہ دلی، فراخ حوصلگی، الفت و یگانگت کے مال مسالوں سے لپی تپی سجی بنی اپنی بہاریں دکھاتی تھیں۔ انسان کی جو فطرت ہے وہ تو ہے کبھی کبھار کیوں اکثر اونچ نیچ اور تلخیاں بھی ہوتی ہوں گی لیکن فوراً ہی کچھ لوگ درمیان میں آ کر صلح صفائی کے مرہم لگا دیتے تلخیاں ڈھل جاتیں دل میں اٹکی اور پھنسی پھانس چن چن کے نکال دی جاتی۔

بارے شادیوں میں کھانے کا بیان ہو جائے .....

''بی بی جی کا خیال صحیح نکلا۔ میاں صاحب کی بہنیں آئیں جو بہن اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے سفر نہ کر سکی ان کی شادی شدہ بیٹیاں اور بیٹے آ گئے، خوب رونق ہو گئی۔ مہمانداری بالکل آسان۔ وہی ایک سالن اور روٹی جو سب کے گھروں میں عام پکنے کا دستور تھا۔ دن میں گوشت سبزی کا سالن یا شوربا۔ رات کو بھی سادہ ہی کھانا دال چاول یا دال روٹی..... مہمانداری میں کام ہی بڑھ جاتا۔ مہمانداری دل کا بوجھ نہیں بنتی تھی۔ جس کا دل چاہے اتنے دن ٹھیرے۔ سب رشتے داروں سے دل بھر کے ملے۔ ہر ایک کے پاس دو دو چار چار دن رہ لے۔ شاید اسی لیے اس زمانے میں رشتے گہرے اور محبتیں مضبوط رہتی تھیں۔''

اب شادیوں میں برات کی روانگی کی جھلک۔

''مولانا کی بیوی نے پوچھا بارات کب کی ہے؟ بی بی جی نے بتا دیا کہ کل صبح خیر سے جانا ہے۔''

تم تو برات میں ضرور ہی جاؤ گی اور کون کون ساتھ جائے گا؟ بی بی حیران ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگیں۔

میں اور برات میں جاؤں؟ بھلا کہیں لگائیاں (عورتیں) بھی جاویں ہیں براتوں میں؟ ہماری برداری میں یہ دستور نہیں برقعے سنبھالتی عورتیں براتوں میں چڑھیں۔''

نیر بانو صاحبہ کی آمد کا ذکر:

''اگلے دن آٹھ اگست کو نور کے تڑکے بی بی جی کے کانوں نے اپنے بے آواز گھر میں زندگی کی پہلی چیخ سنی۔ ان کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یہ انوکھی آواز کہاں سے آ گئی۔ ایک کوکھ جلی کی گود کیسے ہری ہوگئی ۔ چوتھائی صدی کے انتظار کے بعد ایک ناقابل شکست قوت ارادی کے زور پر ایک نئے انسان کی پہلی آواز کا شہد کان میں قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے اس کی مٹھاس ان کے سارے تن بدن کی ایک ایک رگ میں گھلتی جا رہی تھی۔''

''اذان کے بعد میاں صاحب نے بچی کی ننھیال اطلاعی خط لکھا میاں صاحب کو گھر میں بچہ کی مامتا اور خوشی بی بی جی کی نسبت کم نہیں تھی بس مرد ذات بہت صبر اور تحمل سے کام لیتی ہے۔ شکل و صورت بھی من بھاؤنی تھی سوائے اس کے کہ ناک غائب تھی صرف نشان تھا۔''

ناموں کا انتخاب:

''ننھیال نے دو نام بھجوائے امت الرقیب اور امت القوی ددھیال والے نورالنہار، خدیجہ، زہرہ، منیزہ وغیرہ۔ ننھیال کے نام دیکھ کر بیٹے اور بہو کے آگے خط رکھ دیا بی بی جی کے آگے پیچھے دائیں بائیں شاعر ہی شاعر تھے، خود شاعر نہ سہی۔ پنجاب کی آب و ہوا میں حلق سے ق نہیں اترتا اٹک جاتا ہے یا کوا بن جاتا ہے۔''

منی (نیر بانو) کے بھائی کی پیدائش کا ذکر:

''منی کونڈی کے پاس اکڑوں بیٹھ گئی ماں جی نے سونٹھ کی ڈلی کو کونڈی میں ڈال دو چار چوٹوں سے اس کے چھوٹے ٹکڑے کیے اس کے بعد سوٹا منی کو تھما دیا۔ منی پوچھنے لگی۔ ''سونٹھ کا کیا کریں گی؟

اچھوانی بناؤں گی!

اچھوانی کیا ہوتی ہے؟ منی نے سوال کیا۔

ابھی بن جائے گی دیکھ لیجیو۔ انھوں نے بادام پستہ کھوپرا کٹوایا۔ پتیلی میں دو پیالے پانی ڈال کے انگیٹھی پر رکھا ساتھ ہی چینی اور گھی ڈال دیا۔ جب گھی چینی کا شربت اچھی طرح پک گیا تو کٹا ہوا بادام پستہ اس میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی پسی ہوئی دو چمچیاں سونٹھ اور دو تین چمچے اجوائن کے دانے ڈالے لین جناب اچھوانی تیار۔ ایک پیالہ بھر کے بہو کے واسطے نکالا اور ایک چھوٹی کٹوری میں تھوڑی سی اچھوانی منی کو دی کہ وہ بھی چکھ لے اور دو دو چار چمچے تو سب گھر والے چکھ ہی لیا کرتے تھے۔''

قارئین کتاب کے کم از کم دس پندرہ صفحات منی (نیر بانو) کی بسم اللہ کی رسم کی تفصیل پر مشتمل ہیں۔ ننھی منی جزئیات کے ساتھ یوں تحریر کیا ہے کہ لگتا ہے اس بسم اللہ میں پڑھنے والا بھی شریک ہے۔ چند ایک فقرے:

''ذکر ہو رہا تھا منی کی بسم اللہ کا اس تقریب کے لیے کپڑے تیار ہونا تھے۔ ابا جی فرمائش کے مطابق کپڑے لے آئے۔ ماں جی نے اسی وقت ہاتھ میں قینچی پکڑی اور کرتے پاجامے کا بیونت کیا، کمی نین کے ہاتھ درزن کے گھر بھجوا دیئے۔''

مہمانوں کو کیا کھلایا جائے؟ خشک ہونٹوں سوکھی زبانوں سے میٹھی باتیں بولنا بہت مشکل ہوتا ہے اگر کوئی میٹھی مزے دار دل خوش کن گفتگو سننے کا آرزو مند ہو تو اسے چاہیے کہ رہنے دو ابھی حلوہ تنجن و شکرانا میرے آگے! پھر شوخیٔ گفتار کا تماشا دیکھئے اس وقت میٹھے دودھ، لسی اور شربتوں کا رواج تو تھا البتہ رنگین میٹھے سوڈا واٹروں سے شناسائی و بے تکلفی نہ تھی۔ ہمارا حلقہ متعارف شربت، عناب و صندل، بید مشک، روح کیوڑہ اور نیلوفر تک محدود تھا۔

گوٹے کناری والے کپڑے پہن کر چار پانچ سالہ منی پڑوس میں کپڑے دکھانے چلی گئی ہر جگہ پر ڈھونڈنے کے لیے لوگ بھیجے گئے ..... منی خود ہی واپس آئی تو بطور خاص ٹیم کو ڈھونڈنے کے لیے مزید لوگ بھجوائے گئے۔ ماں جی نے پوچھا منی کہاں چلی گئی تھیں! جواب دیا شافی کافی کے پاس انھوں نے میرے کپڑے نہیں دیکھے تھے کپڑے دکھانے گئی تھی۔ جیسے لالے کی حنا بندی فطرت کی ذمہ داری ہے اس طرح غالباً انسان کے اندر حسن آرائی اور حسن نمائی اس کی ساخت میں گندھا ہوا ایک جذبہ ہے جسے اقبال نے لالے کی حنا بندی اور اشفاق احمد نے تشبیہ اور استعارے سے گزر کر آسان اور صاف صاف پہیلی بوجھ دی کہ ''میں خوبصورت لگوں'' اب اس کے بعد کہنے کو کیا رہ گیا!

بسم اللہ کے بعد کمی نین نے لڈوؤں کی سینی حافظ صاحب کے آگے کی۔ تھوڑا سا ٹکڑا توڑ کر منی کے منہ میں رکھ دیا اور باقی لڈو قریب کھڑے بچے کو پکڑا دیا۔

پھر کمی سب بچوں کے ہاتھوں میں ایک ایک لڈو تھماتی چلی گئی۔ ساتھ والے تین گھروں اور سڑک کے اس پار چھوٹے ماما جی والوں کے لیے چار رکابیوں

میں پانچ پانچ لڈو رکھے یہ رکابیاں گول سینی میں رکھیں اوپر خوان پوش رکھا خوان پوش بھی کلیاں ڈال کر گول بنایا ہوا تھا۔ گول کنارے پر چوڑا پھٹا گوکھرو اور چمپا ٹنکی تھی۔ درمیان میں دھنک کی دھاریاں تھیں جہاں یہ دھاریاں بیچ میں ملتی تھیں وہاں گولائی میں گول چندوا تھا اسے بھی چوڑے ٹھپے گوکھرو دھنک اور چمپا کے پھولوں سے سجا سنوار رکھا تھا۔

بسم اللہ کے بعد منی کا اردو کی نظموں والی کتب پڑھنا بھی دلچسپ پیرائے میں بیان کی اگیا ہے..... غلط تلفظ کسی سے برداشت نہیں ہوتا تھا، لکھتی ہیں:

''بھائی منور نے صحیح کر دیا۔ منی اس دن کی تصحیح آج تک نہیں بھولی لفظوں کی زیر زبر کی جانچ پرکھ اس کے ذہن میں رچ بس گئی۔ ان لوگوں کی دولت ہی لفظ تھے۔ عبارتیں ہوں یا شعروں میں پروئے ہوئے لفظ ان کے لیے ہیرے موتیوں اور جواہر سے کم نہ تھے۔ ماما جی کی محفل سرا میں اچھے موسموں میں ہمیشہ دوسرے تیسرے مہینے مشاعروں کی محفلیں جمتیں۔ طبع موزوں اللہ کی دین ہے اس میں فطرت مرد عورت کا فرق نہیں کرتی۔ جس ماں کی گود میں شاعر بیٹے جنم لیتے ہیں اس ماں کی گود میں ایسی بیٹیاں بھی جنم لے سکتی ہیں جن کے ذہن وخیال میں شاعری کا ذوق رچا بسا ہو۔ اگر شعر کہنے کا موقع میسر نہ آ سکا ہو تو شعر سمجھنے کا ذوق تو ابھر نکھر سکتا تھا۔ بھائی منور کی دادی اماں نے موزوں طبع پائی تھی مگر ان کی شاعری حمد ونعت پر ہی مرتکز رہی۔ ان کی بڑی بیٹی حمد ونعت کے علاوہ منظوم قطعے اور مثنویاں وغیرہ مطالعہ کرتی رہتی تھی۔''

بچوں سے دوستی کے سلسلہ میں نیر بانو صاحبہ کا مطالعہ ایک ماہر نفسیات کا ہے اور کتاب کی خوبی بھی یہی ہے کہ یہ بیک وقت کئی چیزوں کو ساتھ لے کے چلتی ہے لکھتی ہیں:

''بچوں سے دوستی کرنا ایک فن ہے جو ہر ایک کو نہیں آتا مثلاً جس کو بچے بہت ہی اچھے اور پیارے لگتے ہوں، وہ ان کی چھوٹی چھوٹی اور فضول بے کار باتیں توجہ سے سن سکتا ہو، ان کے ساتھ ہنسے خوش رہے ان کی عقلمندیوں کی داد دے اور تعریف کرے۔ جو بچوں سے گھبرائے اور دور بھگائے اور بدتمیزیوں پر ڈانٹ دے ان کے ساتھ دوستی مشکل ہے۔ بچے ایسے بزرگوں کو راز دار نہیں بناتے ان کے پاس نہیں پھٹکتے۔

کتاب میں جا بجا مزے مزے کے قصے بکھرے

پڑے ہیں۔ زاہد حسین کی شادی کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ پھر کم سن منی کا کالکا کا طویل سفر جس میں دو جگہ ٹرین بدلنا پڑی۔ کالکا سے لاہور آمد اور مغل پورہ میں قیام، پاکستان سے قبل کے لاہور کا ذکر یہ سب پڑھتے ہوئے انسان اسی زمانہ میں پہنچ جاتا ہے اور ماضی کا سفر انتہائی خوشگوار ثابت ہوتا ہے۔ جو بھی لکھا ہے سادگی کے ساتھ لکھا یہ اور بات ہے کہ کہیں کہیں کسی کی سادگی ہی حاوی ہوتی ہے اور دل موہ لیتی ہے۔

تو جناب یہ تھی ''چراغوں کا دھواں'' کی ''ونڈو شاپنگ'' کیسی لگی، رائے سے ضرور نوازیے۔ فی امان اللہ۔

گولا کنڈا

بعض اوقات پرانی فائلوں سے جھانکتی ماضی کی کچھ ایسی یادوں سے ملاقات ہو جاتی ہے جو برس ہا برس کی گرد پڑنے کے باوجود اپنی دلکشی برقرار رکھے ہوئے ہوتی ہیں۔ایسی ہی ایک خوبصورت یاد.....جس سے ملاقات میں آپ کو بھی شریک کر رہی ہوں

مختلف رنگوں سے سجا، باریک سی اسٹک پہ سختی سے جما، برف کا خوبصورت سا گولا جھلستی گرمیوں کی خاص سوغات ہے۔ خاص طور پہ انسان کا بچپن اس گولے گنڈے کے بغیر بالکل ایسے ہی ادھورا اور بے رنگا لگتا ہے جیسے پھول رنگین تتلیوں کے بنا اداس اور ادھورے لگتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ ہرے، پیلے اور سرخ رنگوں سے سجا گولا گنڈا ہمیں اب بھی اتنا ہی پر جوش کر دیتا ہے جتنا پہلے کبھی کیا کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ آج بھی اگر کہیں نظر آ جائے تو ہم اسے کھانے کو مچل جاتے ہیں۔

آج ہم آپ کو اسی جمی برف کا قصہ سنائیں گے جو بالکل گولے جیسا ہی رنگیلا ہے۔تو سنئے! ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ ہم نے آنٹی رشیدہ صدف کے پاس ترجمہ پڑھنے کی نیت سے جانا شروع کیا۔ پورے دن کی مصروفیت کے پیش نظر مغرب کے بعد کا وقت مختص ہوا۔

یہ تیس اپریل کا ذکر ہے۔موسم بے حد خوشگوار تھا۔ گزری شاموں کی طرح تیس اپریل کی شام بھی خنکی سے بھرپور تھی۔ ہم پیپر دے کر آئے تو ایسا سوئے کہ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی آنکھ کھلی۔جلدی سے نمازِ مغرب ادا کی اور قرآن پکڑے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ساتھی طالبات کو لیا (چونکہ ہمارا گھر سب سے آخر میں واقع ہے لہٰذا یہ فریضہ بھی ہمیں ہی انجام دینا ہوتا ہے) موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آنٹی بشریٰ کے گھر سے شارٹ کٹ لیا۔ان کے گھر کا پچھلا گیٹ آنٹی رشیدہ کی گلی میں کھلتا ہے سو ہمیشہ سے ہی پچھلی گلی میں جانے کے لیے آنٹی بشریٰ کا گھر زندہ باد .....

ابھی گیٹ کا بولٹ ہٹا کر باہر قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے سے گولے گنڈے والا مختلف رنگوں کی بوتلیں سجائے، ریڑھی گھسیٹتا ہوا آتا دکھائی دیا۔

''اوہ، گولے والا آ رہا ہے۔'' یہ ہانک کنزیٰ نے لگائی تھی۔

''ہیں ں ں ں .....لیں، گولا لیں؟'' یہ سمیرا محمود تھیں جو ایسا گند بلا کھانے کے معاملے میں ہم سب

سے زیادہ چٹوری واقع ہوئی ہیں۔

''لینا ہے تو لے لو، میرے پاس پیسے ہیں۔'' کنزیٰ نے فیاضی کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے کھلے دل سے آفر کی۔

''ارے ڈھکن! وہ اس وقت گھر واپس جا رہا ہو گا، برف ہو گی ہی نہیں اس کے پاس .....'' ہم نے سیانت بھرے لہجے میں کہا۔

''پوچھ لیتے ہیں نا..... ہوا تو ٹھیک نہ تو نہ سہی.....'' سمیرا کے کہے پہ انتہائی فرمانبرداری سے سر ہلاتے ہوئے ہم گیٹ کے سامنے ہی کھڑے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔

''انکل گولا ہے؟؟'' تیز رفتاری سے لڑھکتے پہیوں کے قریب آتے ہی کنزیٰ نے جلدی سے پوچھا۔

''جی بیٹا ہے۔'' انھوں نے سرخوشی کے عالم میں جواب دیا۔ شام کے بڑھتے سایوں میں جبکہ وہ یقیناً گھر جا رہے تھے ان سے بھلا کس نے گولا لینا تھا؟ ایسے میں غیر متوقع طور پہ اکٹھے اتنے سارے لوگوں کو دیکھنا خوشی کا باعث تھا سو گولے والے انکل بھی خوش دکھائی دے رہے تھے۔

''کتنے بنا دوں؟'' برف سے کپڑا ہٹاتے ہوئے وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ تھکن کے وہ آثار جو کچھ دیر قبل ان کے چہرے سے مترشح تھے اب گویا ان کے ہاتھوں کی پھرتی تلے کہیں دب سے گئے تھے۔

''کتنے کا ہے؟'' کنزیٰ کو شاید پیسوں کی فکر ہوئی تھی۔

''پانچ والا بھی ہے اور دس والا بھی.....''

''کون سا لینا ہے؟'' اس نے ہمیں دیکھ کر استفسار کیا۔

''دس والا .....دس والا .....دس والا۔'' ہم تینوں اکٹھے بولے۔ اب اگر لے ہی رہے تھے تو بڑا کیوں نہ لیتے۔ موقع اچھا تھا۔ وقت مناسب تھا اور دلانے والے کا دل فیاضی پہ مائل تھا سو فائدہ کیوں نہ اٹھاتے۔''

''اور کتنے؟'' ایک دفعہ پھر دریافت کیا گیا۔

''چار ہم ہیں اور ایک آنٹی .....تو پانچ لے لو۔'' اندازہ لگاتے ہوئے جواب دیا تو اچانک آنٹی کے گھر میں مقیم مریم کا خیال آیا۔ ''ہائے مریم بھی تو ہے..... چھ لو.....ہم نے جھٹ پیچھے سے ہانک لگائی۔

''کنزیٰ! پیسے ہیں نا؟'' ہم نے یقین دہانی

چاہی۔اگر عین وقت پہ پیسے نہ نکلتے تو کتنی سبکی ہوتی۔

''ہاں..... ہیں پیسے.....'' انتہائی یقین سے کہتے ہوئے وہ پیچھے کو ہو کر ہاتھ میں پکڑی اپنی ڈائری ٹٹولنے لگی۔گولے والا، گولا بنانے میں مصروف ہو گیا۔

ڈائری سے بیس روپے نکلے۔ہم دھک سے رہ گئے۔

''اللہ.....! کنزیٰ میں بھاگ کر پیسے لے آتی ہوں۔'' بے عزتی کے احساس سے ہم فوراً بولے۔

''نہیں نا..... پیسے تھے میرے پاس.....ادھر ہی تو رکھے تھے میں نے'' اب وہ تیزی سے قرآن مجید کے صفحات ادھر ادھر کر رہی تھی۔ایک صفحہ پلٹنے پہ دس، دس کے سات، آٹھ نوٹ نکل آئے۔

''بدتمیزو! یہ صدقے کے پیسے رکھے تھے میں نے'' مطلوبہ رقم نکالنے پہ اس نے انکشاف کیا تو ہم چلا ہی تو اٹھے۔

''کیا؟؟؟ صدقے کے پیسے؟؟؟ کنزیٰ میں ہرگز ان پیسوں کا گولا نہیں کھاؤں گی۔'' آپ ہی کہیے، صدقے کے پیسوں سے ہم بھلا کیونکر کچھ کھا سکتے تھے؟

''اوہ کچھ نہیں ہوتا، میں ان میں اور پیسے رکھ دوں گی نا'' اس نے ہمیں مطمئن کرنا چاہا۔

''نہیں تم ابھی نیت بدلو.....فوراً.....صدقے کی نیت سے دوسرے رکھ لینا۔اب نیت کرو کہ ان سے تم قرآن کے اسٹوڈنٹس کو کچھ کھلا رہی ہو۔یہ بھی ثواب کا کام ہے۔'' اپنے چسکوں کو ہم نے انتہائی اطمینان سے ثواب کے کام سے نتھی کیا.....صرف دل کی تسلی کے لیے۔

''اہو.....اچھا! اب تم دونوں یہ دو گولے پکڑ کر جاؤ۔ہم دوسرے لے کر آتے ہیں۔'' انھوں نے مجھے اور میمونہ باجی کو دو گولے پکڑا دیے۔برف تیزی سے بہہ رہی تھی ہم ایک ہاتھ سے قرآن سنبھالے، دوسری میں گولا پکڑے، تیز تیز چلتے آنٹی کے گھر کی طرف بڑھے۔

جلدی سے بیل دی۔آنٹی نے اوپر سے پوچھا

''کون؟''

''حفصہ .....'' انھوں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

''دیکھا قرآن کی کشش کھینچ ہی لائی نا.....'' وہ ہماری آواز سنتے ہی کھل اٹھیں۔ہمارے پیپرز ہو رہے تھے سو آنٹی نے یہی سوچا تھا کہ ہم نہیں آئیں گے۔

''آنٹی ہم آپ کے لیے گولے لائے ہیں'' تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم نے نیچے سے ہی

بولنا شروع کر دیا۔ گولا تیزی سے پگھل رہا تھا۔

''ہیں ..... کیا لائے ہیں؟؟'' وہ حیرت سے بولیں۔

''گولا .....آنٹی گولا۔'' یہ کہتے ہوئے ہم اوپر پہنچ گئے اور جلدی سے گولا ان کے آگے کر دیا۔ آنٹی اور مریم ریلنگ کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ ہمارے ہاتھوں میں گولے دیکھ کر حیرت سے ہنسنے لگیں۔

''اللہ..... یہ کہاں سے مل گئے آپ کو؟؟''

''راستے میں ریڑھی والا آ رہا تھا نا آنٹی تو اس سے لیے ہیں۔'' ہم نے جوش سے کہتے ہوئے ایک گولا انھیں اور ایک مریم کو تھمایا۔ انھوں نے جلدی سے لیتے ہوئے چوسنا شروع کیا تو ہمیں بالکل بچوں جیسی خوشی ہوئی۔ یقین نہیں تھا کہ واقعتاً آنٹی بھی ہمارے ساتھ وہ گولا کھائیں گی۔

''وہ دونوں کہاں ہیں؟'' آنٹی نے کنزیٰ اور سمیرا کی بابت پوچھا۔

''وہ پیچھے آ رہی ہیں آنٹی ..... باقی کے گولے لے کر.....''

تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں سے ایک مرتبہ پھر شور بلند ہوا۔ وہ دونوں آئیں تو مت پوچھئے کہ کیا حال تھا ..... ہری، پیلی اور سرخ دھاریاں دونوں ہاتھوں سے بہہ رہی تھیں۔

ان کے ہاتھوں سے گولا پکڑتے ہم نے تیزی سے کھانا شروع کیا جو پگھلے جا رہا تھا۔ مریم کا شکر یہ کہ اس نے ایک عدد پلیٹ تھما دی۔

اتنے میں آنٹی بولیں۔ ''بھئی میرا گولا فریزر میں رکھ دو ..... میں بعد میں کھاؤں گی'' وہ چائے پی رہی تھیں سو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا ''آج تو آپ لوگوں نے میرا بھی بچپن تازہ کر دیا۔''

''لو یہ میرا تو ٹوٹ گیا۔'' مریم کی آواز پہ ہم نے اس کی پلیٹ کی طرف دیکھا تو قہقہہ لگا کر رہ گئے۔ پلیٹ سرخ، سبز اور پیلی برف سے بھری ہوئی تھی۔

''اسے چمچ سے کھا لو.....'' ابھی ہم اسے نصیحت کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں میمونہ باجی کی آواز آئی۔

''یہ دیکھیں نا ..... یہ میرا گر گیا ہے'' انتہائی معصومیت سے جب انھوں نے اپنی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا تو کوئی بھی اپنی ہنسی نہیں روک سکا۔ ہم البتہ آخر دم تک انتہائی محتاط طریقے سے کھاتے رہے اور صد شکر کہ ہم نے پتلی چھڑی کے ساتھ ہی لگی پوری برف ختم کی۔

جب سب نے کھا لیا تو آنٹی نے سورہ مزمل کا مرکزی مضمون بیان کرنا شروع کیا۔اس کے ساتھ ہی اس پگھلتے گولے نے ہمیں سوچ کا ایک نیا سرا تھمایا۔ وقت کی برف بھی تو ایسے ہی تیزی سے پگھلتی جارہی ہے نا.....تیزی سے پگھلتے ہوئے، گھلتے ہوئے فنا کی طرف رواں دواں ہے اور ایک دن یہ ساری برف گھل جائے گی۔ مائع بنے گی اور ختم ہو جائے گی۔اسی لیے تو انشا جی کہتے ہیں۔

سب مایا ہے
سب ڈھلتی دھوپ کی چھایا ہے

لیکن ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ وقت کا لحظہ بہ لحظہ گھلنا ہمیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔

یہی وہ برف ہے جس نے امام رازیؒ کو سورۃ العصر کا مرکزی مضمون سمجھایا۔فرماتے ہیں۔''میں نے وقت (العصر) کی حقیقت ایک برف فروش سے سمجھی جو کہے جا رہا تھا کہ''اے لوگو! اس شخص کے حال پہ رحم کرو جس کا سرمایہ گھلا جارہا ہے۔''

بہر کیف ..... ترجمہ پڑھنے کے بعد ایک اور خوبصورت شام کو اپنی یادوں میں سموئے ہم نے واپسی کا قصد کیا۔ سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ سفید ماربل پہ ایک قطار سے ہرے، پیلے اور سرخ قطرے گرے دکھائی دیے۔ پیلے قطرے تو یوں دکھ رہے تھے گویا کسی نے ہلدی ملی ہو۔ باہر بارش کے بے رنگ قطرے پھوار کی صورت برس رہے تھے اور اندر رنگین قطروں کی برسات تھی۔

''یہ تو مریم صبح سیڑھیاں صاف کرے گی تو اسے پتہ چلے گا۔''

کھلکھلا کر ہنستے ہوئے تیز ہواؤں اور گرتی بوندوں کے درمیان ہم اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

یہ آتی گرمیوں کا پہلا گولا کنڈا تھا.....لیکن..... آخری نہیں!!

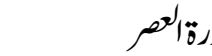

آم اور جامن

موسم گرما کی بہترین سوغاتیں جن میں لذت بھی ہے اور صحت بھی

آم: نہایت خوش ذائقہ اور لذیذ پھل ہے اور کوئی کتنا بھی خود کو کیوں نہ روک لے لیکن جب آم سامنے ہوں تو یہ ممکن ہی نہیں رہتا کہ اسے کھایا نہ جائے۔

ہر دور میں آم کو پسند کیا جاتا رہا ہے۔ آم کے بارے میں بہت سے محاورے بھی زبان زدعام ہیں۔''آم کے آم گٹھلیوں کے دام،آم بوؤ آم کھاؤ،آم کھانے سے کام یا پیڑ گننے سے،آم کھائے پال کا خربوزہ کھائے ڈال کا، پانی پیئے تال کا۔'' مرزا غالب کو آم بہت پسند تھے۔ان کا یہ جملہ بھی جوانہوں نے آموں کے بارے میں کہا تھا مثل بن چکا ہے''آم ہوں پر عام ہوں''

گرمی کے موسم کا خاص تحفہ آم ہے۔اسے پھلوں کا بادشاہ کہا جائے تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں یہ روایت شروع سے چلی آرہی ہے کہ لوگ گرمیوں کے موسم میں''آم پارٹی'' کا اہتمام کیا کرتے ہیں۔آموں کو بڑے بڑے پانی سے بھرے ٹبوں میں ڈال کر اس میں برف کے ٹکڑے کاٹ کر ڈال دیے جاتے ہیں اور ٹھنڈا ہونے پر مہمانوں کے آگے ٹب رکھ دیے جاتے ہیں تمام لوگ ٹب کے اردگرد بیٹھ کر خوب ڈٹ کر آم کھاتے ہیں مگر آہستہ آہستہ اب یہ روایت دم توڑ رہی ہے۔لوگ کھانے کے معاملے میں بہت محتاط ہو چکے ہیں اس لئے آم پارٹیاں اب کم کم دکھائی دیتی ہیں۔ اب تو آموں کو فریزر میں ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔اس کی قاشیں کاٹ کر ایک یا دو کھائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی ایک آم کے بعد دوسرا لینے کی کوشش کرے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سرزنش کی جاتی ہے مگر سچ تو یہی ہے کہ جب اسے کھانے کیلئے بیٹھا جائے تو یہ تعداد میں کثیر ہونے چاہئیں کیونکہ یہ واحد پھل ہے جسے کھانے کے بعد مزید کی تشنگی باقی رہتی ہے۔

آم کی بہت سی اقسام ہیں جن میں سہارنی، دوسہری، لنگڑا، انوررٹول اور فضلی بہت مشہور ہیں۔

چوسنے والے آم اب کم کم ہی رہ گئے ہیں۔ پنجاب اور سندھ کی سرزمین آموں کی کاشت کیلئے بہت موزوں ہے۔

بلاشبہ آم ہماری صحت کا محافظ ہے اس میں وٹامن اے بی اور سی کے ساتھ ساتھ کیلشیم، فاسفورس، پروٹین اور بہت سے حرارے پائے جاتے ہیں۔

یہ ہمارے نظام انہضام کو درست رکھتا ہے۔ جن لوگوں کو تیزابیت رہتی ہے یا بدہضمی کی شکایت ہو ان کیلئے آم بہت فائدہ مند ہے۔ اس میں بائیوا یکٹو جیسے عناصر ہاضمہ کو درست رکھتے ہیں۔

جن بچوں یا بڑوں کو پڑھائی کے دوران یاد کرنے اور توجہ کرنے میں دقت پیش آتی ہے، آم کے استعمال سے انہیں یاد کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ آم کے اندر Glutamine موجود ہوتا ہے جو یاداشت کو تیز کرتا ہے اور خلیات کو متحرک کرتا ہے۔

آم کے استعمال سے جسم میں کولیسٹرول کی مقدار کم ہوتی ہے۔ اس میں موجود وٹامن سی اور Pactin خاص طور پر LDL کولیسٹرول کو کم کرتی ہے۔ آم چہرے کی خوبصورتی بڑھانے میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ اس کے کھانے سے چہرے کی رنگت سنہری ہوتی ہے اور دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ چہرے پر موجود کیل مہاسوں اور چھائیوں کو دور کرنے کیلئے آم کا استعمال بے حد مجرب ہے۔ آم کی نہایت باریک کاشیں کاٹ کر اس کو چہرے پر دس سے پندرہ منٹ کیلئے رکھیں اس کے بعد ہلکے سے گرم پانی سے منہ دھوئیں آپ اپنے چہرے کی جلد کو بہتر محسوس کریں گے۔

اس میں موجود پوٹاشیم کی بڑی تعداد بلڈ پریشر کنٹرول کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کا استعمال گردے کی پتھری سے حفاظت کیلئے بھی نہایت مفید ہے۔

آم میں کثیر تعداد میں آئرن موجود ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو خون کی کمی کا شکار ہوں ان کو اپنی خوراک میں آم کو ضرور شامل کرنا چاہیے۔ وہ خواتین جن کو پچاس سال کے بعد ماہواری آنا بند ہوجاتی ہے ان کے لئے آم کھانا مفید ہوتا ہے کیونکہ اس وقت جسم میں آئرن، فاسفورس اور کیلشیم کی کمی ہوجاتی ہے جس کو پورا کرنے کیلئے آم کا استعمال اچھا ہوتا ہے۔ حاملہ خواتین کیلئے بھی آم بہت فائدہ مند ہیں مگر زیادہ مقدار میں نہ کھائیں۔

ذیابیطس کے مریضوں کے لئے آم نقصان دہ

نہیں بلکہ فائدہ مند ہیں کیونکہ یہ بیماری کے خلاف قوت مدافعت بڑھاتے ہیں نہ صرف آم بلکہ اس کے پتے بھی اس بیماری میں فائدہ مند ہیں۔

آم میں بڑی مقدار میں Antioxidiants موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر آم کا استعمال باقاعدگی سے کیا جائے تو اس سے جسم میں کینسر اور دل کے عارضوں کے خلاف قوت مدافعت پیدا ہوتی ہے۔

آم کھانے سے کمزور ہوئی نظر بھی بحال ہوتی ہے کیونکہ اس میں وٹامن اے بکثرت پایا جاتا ہے جو آنکھوں کی صحت اور نظر کے لئے بہت فائدہ مند ہے یہ رات کے اندھے پن سے بھی بچاتا ہے اس کے علاوہ آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی اور خارش کو بھی روکتا ہے۔

جن لوگوں کا وزن کم ہو اور وہ وزن بڑھانا چاہتے ہوں وہ آم کا استعمال باقاعدہ کریں۔

آم کھانے کے بعد دودھ کی کچی لسی کے ایک یا دو گلاس ضرور پی لیں یا چند جامن کھانے سے جسم کی گرمی اور طبیعت کی گرانی دور ہوتی ہے اور بشاشت پیدا ہوتی ہے۔

آم ہمارے روزمرہ کے کھانوں کی لذت کو دوبالا کرتا ہے۔ آم کا اچار، مربے اور چٹنیاں کھانے کی میز پر کھانے کی اشتہا کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ زود ہضم بھی بناتے ہیں۔

آم کا ملک شیک، آم کی آئس کریم، آم کا جوس، سکواش جیم ہمارے روزمرہ کے معمولات میں شامل ہو چکے ہیں۔

☆.....☆.....☆

جامن: ہمارے ملک پاکستان میں جامن کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں بلکہ اکثر گھروں میں بھی لوگ جامن کے درخت شوق سے لگواتے ہیں۔ اس کا درخت کافی قدآور ہوتا ہے اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہمارے دیہات کے لوگ گرمی کی دوپہریں بھی گزارتے ہیں۔ جامن کی دو قسمیں ہیں ایک قسم میں پھل بیضوی شکل میں ہوتا ہے جسے ''سودا جامن'' کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم میں پھل چھوٹا اور گول ہوتا ہے اسے ''کھٹا جامن'' کہتے ہیں۔ یہ رس دار پھل ہے جس کی گٹھلی سخت ہوتی ہے یہ باہر سے کالا اور اندر سے بنفشی ہوتا ہے۔ اس کا گودا ترشی مائل میٹھا اور بیج سبز مائل زرد ہوتا ہے۔

یہ وٹامن سی سے بھرپور ہوتا ہے۔ سندھی اور پنجابی

زبان میں اسے ''جموں'' کہتے ہیں ۔ اس کے پھل پھول چھال پتے اور گٹھلی کا بطور دوا استعمال عام ہے۔ موسم گرما کی شدید گرمی اور برسات کے موسم میں تیزابیت زیادہ ہوجاتی ہے۔ ہر طرف پھوڑے پھنسیوں اور خون میں حدت کی شکایت ہوتی ہے ایسے موسم میں اللہ تعالیٰ نے پیاس کی شدت کم اور خون کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لئے جامن کی شکل میں میوہ پیدا کیا ہے۔ یہ معدہ، جگر اور آنتوں کو تقویت دیتا ہے۔ بھوک میں اضافہ کرتا ہے، خون میں سرخ ذرات کو بڑھاتا ہے۔ شوگر کا قدرتی علاج ہے۔

ذیابیطس جس میں لبلبے کے بگڑنے سے خون میں شکر کی مقدار زیادہ ہوجاتی ہے اور پیشاب میں بھی خارج ہونے لگتی ہے اسے کنٹرول کرنے میں جامن کا استعمال انتہائی مفید ہے۔ اس میں شامل گلوکوسائڈ نشاستے کو گلوکوز میں تبدیل ہونے سے روکتا ہے۔ لیکن اس مرض کی مروجہ ادویات کی بجائے صرف جامن کے استعمال پر انحصار کرنا کسی طور مناسب نہیں۔ شوگر کے مرض میں جامن کا سرکہ بھی مفید ہے بشرطیکہ اس میں سنتھیٹک اجزا نہ ملائے گئے ہوں۔ علاوہ ازیں اسہال، گیسٹرو اور پیٹ کے دیگر امراض کے لئے جامن کا سرکہ فائدہ مند ہے۔

لو لگنے کی صورت میں جامن کھانے سے لو کے اثرات کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ جامن کے استعمال سے خون کا گاڑھا پن اور تیزابیت ختم ہوجاتی ہے۔ چہرے کے داغ دھبے، چھائیاں جامن یا جامن کے شربت کے مسلسل استعمال سے دور ہوجاتے ہیں اور چہرے کی رنگت نکھر آتی ہے۔ چہرے کی شادابی بڑھانے کے لئے جامن کی گٹھلیوں کو پانی میں رگڑ کر اس کا پیسٹ چہرے پر لیپ کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات جلنے سے جلد پر سفید بدنما داغ پڑجاتے ہیں ان داغوں پر جامن کے پتوں کا رس لگانے سے جلد کی اصل رنگت لوٹ آتی ہے۔

منہ سے بدبو آنے کی صورت میں جامن کھانے سے بدبو رفع ہوجاتی ہے۔ جامن گرتے بالوں کو روکنے کے لئے انتہائی مفید ہے۔ اگر کبھی سرکا بال کھانے کے ساتھ معدے میں چلا جائے تو وہ ہضم نہیں ہوتا اور معدے کے ساتھ چپکا رہتا ہے۔ جامن کھانے سے وہ بال معدے کی جلد کو چھوڑ کر نظام ہضم کے ذریعے تحلیل ہوجاتا ہے۔

جامن میں فولاد بھی پایا جاتا ہے۔ خون کی کمی

والے لوگ اس کا استعمال کریں۔ یہ جسم کو تقویت دیتا ہے۔ پیشاب کی جلن دور کرتا ہے۔ اگر کبھی منہ پک جائے تو جامن کے نرم پتے ایک پاؤ ایک کلو پانی میں جوش دیں بعدازاں چھان کر کلیاں کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ آنکھوں کے ورم کے لئے بھی مفید ہے۔ بھوک کی کمی کی صورت میں جامن کا گودا نکال کر کالا نمک، زیرہ سیاہ مرچ تھوڑی سی شکر شامل کر کے شربت بنالیں چند روز کے استعمال کے بعد بدہضمی اور بھوک کی کمی دور ہو جائے گی۔

جن لوگوں کو وٹامن سی کی کمی کی وجہ سے مسوڑھوں میں خون آتا ہے وہ جامن کے پتوں کو پانی میں جوش دلا کر نمک ملا کر غرارے کریں۔

خالی پیٹ جامن مت کھائیں، معدے کے لئے مضر ہے۔

(استفادہ انٹرنیٹ)

☆☆☆

محشرِ خیال

افشاں نوید۔کراچی

اپریل کا شمارہ ہاتھ میں ہے اور دل چاہ رہا ہے کہ آپ کی کاوشوں اور قلمکاروں کی استقامت کو خراج تحسین پیش کروں جو اتنی باقاعدگی سے قلم سے رشتہ نبھا رہے ہیں اور گلوں میں رنگ بھر رہے ہیں کہ ''بتول'' کھولو تو لگتا ہے کہ اودے نیلے، پیلے، سبز اور سفید پیر اہنوں میں ملبوس گلوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں گویا روش روش پہ بکھرا سبزہ اک اک پل پہ قدم باندھتا ہے، تب اقبال پکارتے ہیں کہ

؎ قید مقام سے گزر!

سچ پوچھیں تو یوں انتظار ہوتا ہے بتول کا جیسے نئے موسم کا انتظار۔ اور آپ ہی جانیں سب موسموں کے اپنے ہی رنگ روپ، ناز و انداز۔ کچھ تحریریں برکھا کی ست رنگی، شوخی و رنگینی لئے ہوتی ہیں تو کچھ سرما کی خنکی و یخ بستگی (جسکا اپنا ہی لطف و سرور) خزاں کی ویرانی و پژمردگی شاید ہی کہیں نظر آئے (جن کو خزاں کے موسم بھاتے ہیں وہ اس کے سحر اور نشے کو بھی جانتے ہی ہوں گے) کچھ تحریریں گرمی کی سی حرارت اور حدت لئے ہوئے، اور کچھ شگفتہ شگفتہ تحریریں تو چھیل چھبیلے موسموں کی آمد جیسی، ہاں بالکل موسم بہار، جس کی آمد کا احساس ہی آنکھوں پہ پھول باندھ دیتا ہے، اور رہا شاعرانہ انتخاب!! تو اکثر لاجواب ہوتا ہے۔

؎ کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا، نہ سنا ہوا

قانتہ رابعہ کا سفر سعادت پڑھتے ہوئے پس منظر میں کہیں یہ شعر گونج رہا تھا اور ان کے پاکیزہ جذبوں کی صدا امرت بن کر روح میں اتر رہی تھی۔

؎ قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں سے بہر خدا آج ذکرِ یار چلے

امہات المومنینؓ کی سیرت کے ورق الٹے تو کہیں اللہ کی آواز سنائی دی کہ

ے تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا!

کبھی افسانے حقیقت بن جاتے ہیں اور کبھی حقیقتیں افسانوں جیسی۔ بنت الاسلام، قانتہ رابعہ، ربیعہ ندرت، طوبیٰ احسن کی تحریروں نے چار چاند لگادئے۔اور نصرت یوسف کہتی ہیں کہ چاند راہوں میں کھو جاتے ہیں جبکہ یہاں تو انہیں بھی منزلیں مل جاتی ہیں جو شریک سفر نہیں ہوتے!!

شمیم فاطمہ نے تو خیال میں حشر بپا کر دیا یہ کہہ کر کہ ''انہیں علم ہی نہیں ہوتا کہ قلم کی اڑان میدان میں اتارے گی یا سمندر میں ڈبوئے گی۔''ان کو تو خوب مہارت ہے قاری کی انگلی تھام کر اپنے ساتھ اڑن کھٹولے پر بٹھالیتی ہیں اور پھر نگری نگری کی سیر کراتی ہیں جہاں کہیں کسی نگری میں نکھرے گلاب حسین یادوں سے مشک بُو ہوتے ہیں تو کہیں عشاق کے لہو، کہیں ملالِ احوالِ دوستاں اور کہیں غبار خاطر کے باب سارے۔ ان کی تو بہاریں بھی ''نئے سرے سے حساب سارے'' مانگتی ہیں۔میں نے صائمہ کو مشورہ دیا ہے کہ ''گوشۂ تسنیم'' کے بعد اب ایک ''گوشۂ شمیم'' بھی مختص کرنا پڑے گا جہاں تخت سرخ مخملی گاؤ تکیوں سے سجے ہوں اور دور کہیں سرسوں پھول رہی ہو اور ہوائیں خوشبوؤں کے بار سے بوجھل..... حیران ہوتی ہوں بالکل اچھوتے اوران چھوئے دلنشین احساس کیسے ان کے قلم سے چھوکر چہار سو کومل تانوں کی طرح بکھر جاتے ہیں، واقعی رب کی عطا ہے۔وہ چاہے تو قلم کو بھی جنت کے راستوں کا نشان بنا دے اور قلم کی سیاہی کو بھی شہداء کے خون کی طرح معتبر کر دے۔اور حق کے راستوں میں حق ادا کرادے اس قلم کا.....

بتول کے لکھنے اور پڑھنے والے اللہ کرے جنت کی بہاروں کا ایک حصہ ہوں۔اوراس دنیا میں بھی بہاروں کا اعتبار آپ ہی کے دم سے ہو۔قلمکارانِ بتول جو یادووں میں بستے ہیں! فاضلؔ جمیلی کے ان لفظوں کے ساتھ جو آپ ہی کے لئے ہیں..... بزم بتول کے لئے.....اجازت چاہوں گی۔

تم ہنستی ہو جیسے ساون گاتا ہے
ملھار
تم روتی ہو جیسے بارش وہ بھی
موسلا دھار
تم چلتی ہو صبح سویرے جیسے چلے ہوا
تم رکتی ہو مانگ رہا ہو جیسے کوئی دعا
میں نے جتنے موسم دیکھے یاد تمہاری
آئی

☆☆☆

خورشید بیگم، گوجرہ

الحمدللہ اس بار خلافِ توقع ماہنامہ چمن بتول 5اپریل کو مل گیا۔ ٹائٹل ہی اتنا دلکش ہے کہ دیکھتے ہی پڑھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ماشاءاللہ سارے مضامین اور کہانیاں پڑھنے اور تبصرہ لکھنے کے قابل ہیں۔ ''انوارِ ربانی'' میں موضوع کا انتخاب وقت اور حالات کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ پیارے نبیؐ کا ہر قول ہی پیارا ہے لیکن رفعت اشتیاق صاحبہ نے جن اعمال کی نشاندہی کی ہے وہ اجر کے لئے معمولی مشقت کے طالب ہیں صرف توجہ چاہیے۔ میرے والد محترم زندگی میں ان میں سے اکثر پر کاربند تھے۔ خصوصاً کھانا کھاتے ہوئے سارا وقت سبحان اللہ پڑھتے رہتے اور کھانے کے بعد کہتے اللہ تیرا شکر ہے لاکھوں کروڑوں بار۔ وضو ہر موسم میں بڑے اہتمام سے کرتے اور نماز کا وقت شروع ہوتے ہی مسجد میں جانے کے لئے بیقرار ہو جاتے۔ زندگی کے آخری سال میں نظر کی کمزوری کی بنا پر کلاک پر صحیح وقت نظر نہ آتا تھا۔ بار بار وقت پوچھتے کہ نماز کے لیے بروقت مسجد میں جانا ہے۔ بیمار ہو جاتے تو تکلیف سے زیادہ مسجد میں نہ جا سکنے کا دکھ انہیں پریشان کئے رکھتا۔ جوانی کی عمر سے نماز تہجد کی عادت تھی۔ نمازِ فجر کے بعد مسجد سے واپسی پر ہی انکا ایکسیڈنٹ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ رب کریم نے دنیا میں ہی ان کا آخری دیدار کرنے والوں کو دکھا دیا کہ نماز اور مسجد سے قلبی تعلق رکھنے والوں کے چہرے بعد از مرگ کتنے روشن ہوتے ہیں۔

گوشۂ سیرت اچھا سلسلہ ہے، لیکن اس بار امہات المومنینؓ کے ذکر میں پرنٹ کی کچھ غلطیاں دیکھنے میں آئیں۔ ''صحت مند طرزِ زندگی'' واقعی خاص مضمون ہے۔ سچ یہ ہے کہ قرآن میں ہر بیماری کا علاج اور ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ صرف عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ''بھنور کی آنکھ'' کیا خوب عنوان تجویز کیا ہے محترمہ قانتہ رابعہ نے۔ زندگی کی اصل حقیقت تو یہی ہے۔ لیکن اہل بصیرت ہی اس حقیقت تک پہنچتے ہیں۔ ربیعہ ندرت صاحبہ کی کہانی ''ارمان'' نصیحتوں کی خوبصورت مالا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ والدین ہر قربانی دے کر اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کی ہر خواہش پورا کرنے کے لئے اپنے ارمانوں کا خون کر دیتے ہیں۔ لیکن وہی والدین اگر بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں

تو اولاد کے لئے بوجھ بن جاتے ہیں۔کم از کم ہر مسلمان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ والدین ایک گراں قدر نعمت ہیں۔ان کی خدمت دنیا کی زندگی میں بھی خوش بختی لاتی ہے۔آخرت کا اجر تو ویسے ہی بے حساب ہے۔ اس کے مقابلے میں تکلیف تو بہت کم ہے جو اولاد ان کے لئے اٹھاتی ہے۔

عالیہ حمید صاحبہ نے ماشاء اللہ خوب ''چراغ'' جلایا۔لیکن افسوس کہ ہمارے معاشرے میں ایسے چراغ جلانے والے بہت کم ہیں۔

''کہیں چاند راہوں میں کھو گیا'' کہانی آخر کار مکمل ہوئی۔محترمہ نصرت یوسف صاحبہ کی ذہنی کاوش قابل ستائش ہے۔آج ہماری نوجوان نسل زندگی کی معمولی مشکلات کو پہاڑ جان کر مایوسی کا شکار ہو جاتی ہے جبکہ بعض تو خودکشی جیسی بدترین موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔حالانکہ یہ مسلمان کا شیوہ نہیں۔اللہ کی رحمت سے تو صرف کافر مایوس ہوتے ہیں۔

بہن آسیہ راشد صاحبہ کی مختصر تحریر نے دل کو خوشی وغم کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ربِ کائنات نے ہمیں اس وطن عزیز میں آنکھوں کی ٹھنڈک،دل کی تسکین اور جسمانی صحت وتوانائی کا سامان وافر مقدار میں مہیا کر دیا ہے۔اللہ کرے ہمیں توجہ کرنے والا،غور کرنے والا ذہن اور شکر کرنے والی زبان بھی مل جائے۔

آخر میں ماہنامہ بتول کی تدوین واشاعت کے لئے کام کرنے والی تمام بہنوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ دین ودنیا کی روشنی اس (بتول) کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے۔

☆☆☆

دیے سے دیا جلائیں!

ایک مکتوب اور اس کا جواب

میں کوئی لکھاری نہیں ہوں نہ میں اپنے اندر لکھنے کی صلاحیت پاتی ہوں۔ لکھنے کا شوق ضرور ہے۔ ویسے بھی بتول میں اتنے بڑے بڑے نام ہیں لکھنے والوں کے، کہ میرے جیسا ناقص علم رکھنے والا جرأت ہی نہیں کرسکتا اور میں اپنے آپ کو ہرگز بھی اس قابل نہیں سمجھتی کہ کچھ لکھ سکوں گی اور وہ چھپ بھی جائے گا لیکن کچھ دنوں سے ایک عجیب سی الجھن کا شکار ہوں۔ سوچا کہ کیوں نہ اپنے آپ کو اس الجھن سے نکالوں اور ''بتول'' سے کچھ شکوے کرلوں۔

میرا تعارف رسالہ ''بتول'' سے 2006ء میں ہوا جب ہم لوگ اپنی گورنمنٹ کی نوکری سے ریٹائر ہوکر لاہور آکر سیٹ ہوئے۔ پڑوس میں جماعت اسلامی والوں کا گھر ملا جو کہ میری خوش قسمتی تھی۔ وہاں باقاعدگی سے درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ جانا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ہر ماہ ممبران کے لئے ''بتول'' آتا تھا اور وہ سب لوگ اس سے مستفید ہوتے تھے۔ میں نے زندگی بھر نہ کبھی ''بتول'' کا نام سنا تھا اور نہ اس کی شکل دیکھی تھی۔ خیر میں نے بھی اس کو لینا اور پڑھنا شروع کردیا اور یوں پتہ چلا کہ یہ بھی کوئی میگزین ہے اور بہت زمانے سے شائع ہو رہا ہے جس پر میں بہت حیرت زدہ تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں ''زیب النساء'' اور ''حور'' پڑھا کرتے تھے اور ان ہی سے واقفیت تھی۔ اس زمانے میں قربتیں زیادہ تھیں۔ سہیلیوں میں آپس میں رسالے لینے دینے کا رواج تھا اور ہم ایک دوسرے سے لے کر پڑھتے رہتے تھے۔ شوہر کی ملازمت ایسی تھی کہ سفر کافی کرنا پڑتا تھا اور سٹیشن سے رسالے کتابیں خریدنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا کہ اپنی منزل کبھی ساہیوال، کبھی لاہور، روالپنڈی، نوشہرہ اور کبھی کوئٹہ ہوتی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میرا رسالہ یا کتاب ختم ہوچکی ہوتی حالانکہ بچے بھی چھوٹے تھے اور سارا راستہ ان کی چیاؤں پیاؤں ساتھ لگی رہتی۔ یہ بھی ہوا کہ بچے کو گود میں لے کر فیڈر پلائی جارہی ہے

اور ساتھ رسالہ کی ورق گردانی جاری ہے۔ کہنا یہ چاہتی ہوں کہ کسی سٹیشن کے بک سٹال پر بھی ''بتول'' نظر نہیں آیا۔

اب بڑھاپے میں جا کر اس میگزین سے آشنائی ہوئی۔ اس رسالے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ سبق آموز، نصیحت سے بھرا اور ایمان افروز رسالہ ہے۔ خاص طور پر جوان بچیوں کے لئے۔ افسوس ہے کہ مجھے میری جوانی میں اتنا balanced میگزین کیوں نہ ملا۔

اب میں یہی کہوں گی کہ یا تو اس کی اشاعت کم ہے یا خریدار کم ہیں اور اگر خریدار کم ہیں تو اس کی مارکیٹنگ میں کمی ہے، اس کا تعاون لوگوں سے کیوں نہیں کروایا جاتا۔ اگر میری وہ سہیلیاں جن کے گھروں میں 70ء کی دہائی میں رسالہ آتا تھا۔ انہوں نے اسے آگے بڑھایا ہوتا تو میں اس سے محروم نہ رہتی اور نہ ہی میری بیٹیاں محروم رہتیں۔ بازار میں رسالوں کی بھرمار ہے لیکن اچھا ادب اور اچھا معیار کم کم ہے کچھ کتابیں اور رسالے ایسے ہوتے ہیں جن کا ساری عمروں کا ساتھ ہوتا ہے۔ میں مثال دونگی، ایک انگلش رسالے Reader's Digest کی جو تقریباً تمام دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ بے شک انگریزی پڑھنے اور سمجھنے والے ہی اسے پڑھتے ہیں لیکن اس کی اشاعت میں کچھ اس کی پبلسٹی کا بھی ہاتھ ہے۔ میں یہ کبھی نہیں کہوں گی کہ ''بتول'' کے لئے Cheap Publicity اختیار کی جائے جو کہ اس رسالے کے تقدس کے خلاف ہوگی۔ لیکن کچھ تو کرنا ہوگا کہ ہر طبقے کی خواتین اپنے گھروں میں اسے پڑھیں اور اپنی اولاد اور معاشرے کی اصلاح میں اس سے مدد لے سکیں چاہے ان کے بچے اردو میڈیم کے ہوں یا انگلش میڈیم کے۔ elite کلاس کے گھروں میں ''بتول'' کو جانا چاہیے۔

میرے اپنے دماغ میں ایک ترکیب آئی ہے کہ اگر ہم ''بتول'' پڑھنے والے اپنے خاندان، ملنے ملانے والوں اور رشتہ داروں کو جن کے لئے ہم یہ سمجھیں کہ اس خاندان میں یہ رسالہ جانا چاہیے ان کو اپنے پاس سے یہ رسالہ ایک سال کے لئے جاری کروادیں جبکہ ایک سال کا ہدیہ بھی بہت سے لوگوں کے لئے affordable ہوگا، جب لوگوں کو یہ رسالہ مفت پڑھنے کو ملے گا تو وہ ضرور پڑھیں گے شاید اس طرح کرنا ہی ہمارے لیے صدقہ جاریہ بن جائے اور ان خواتین اور بچیوں کی اصلاح کا کوئی پہلو بھی نکل

آئے۔ یا جن گھروں کے پاس کوئی لائبریری ہے وہ پچھلے سالوں کے رسالے اس کو ہدیہ کردیں۔ بے شک لائبریری جا کر کتاب ایشو کروانے اور پڑھنے کا رجحان کافی کم ہے لیکن کچھ نہ کچھ لوگ تو جاتے ہی ہیں لائبریری میں۔ بہرحال ہمیں کچھ تو کرنا چاہیے۔ بتول پڑھنے والی میری بہنوں کے ذہن میں ہوسکتا ہے اس سے بھی اچھی کوئی تدبیر ہو وہ بھی بتادیں۔ میں نے یہ رسالہ ایک فیملی کے گھر لگوانے کی ابتدا کردی ہے اگر میں خود ابتدا نہ کرتی تو قرآن کی وہ بات مجھ پر صادق آجاتی کہ ''وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔''

ویسے بھی اگر میں خود ابتدا نہ کرتی اور دوسروں کو ہی نصیحت کرتی تو شاید اس میں اثر بھی نہ ہوتا اور برکت بھی نہ ہوتی کیونکہ ہم ہر وقت دوسروں کو ہی کہتے رہتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی نیک کام ہم جیسے گناہ گاروں سے بھی لے لے آمین۔

☆☆☆

بتول کے لیے اپنے نیک جذبات ہم تک پہنچانے کا شکریہ! یقیناً یہ رسالہ ایک صدقہ جاریہ ہے۔ ان نیک روحوں کا جنہوں نے تقریباً ساٹھ برس قبل اس کے اجراء میں اپنی محنت مال اور وقت کھپایا۔ کئی نسلیں اس کو پڑھتے ہوئے بڑی ہوئیں۔ ماؤں نے خود بھی استفادہ کیا اور بچیوں کی تربیت کیلئے بھی اس کو مفید پایا۔ نسلاً بعد نسلٍ اس سے وابستہ ہونے والے سب لوگوں نے اس کار خیر کو رضا کارانہ اور اپنی سعادت سمجھ کر آگے بڑھایا۔ خواہ وہ ادارے کے نگران وممبران ہوں، ادارتی بورڈ ہو، اشتہارات کے ذریعے مالی بوجھ اٹھانے والے ہوں یا کوئی مضمون، کوئی کالم، کوئی ترکیب، کوئی چٹکلہ بھیج کر مستقل اس کی ذمہ داری نبھانے والے لکھاری ہوں۔ اور ان میں وہ قارئین کرام بھی شامل ہیں جنہوں نے اس پیغام کو آگے نئے پڑھنے والوں تک پہنچایا۔ نئے خریدار بنائے اور اس کام کو باقی وابستہ ممبران کی طرح اپنی رضا کارانہ ذمہ داری سمجھا۔ اللہ ان سب کا اجر محفوظ رکھے۔ آمین۔

الحمدللہ ماہنامہ ''بتول'' اس وقت پاکستان کے کثیر الاشاعت ماہناموں میں شمار ہوتا ہے۔ نہ صرف اندرون ملک تقریبا تمام بڑے چھوٹے شہروں میں اس کی ایجنسیاں موجود ہیں بلکہ بیرون ملک مقیم

پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد اس کی خریدار ہے۔ پاکستان سے باہر جن ملکوں میں اس کی مستقل ترسیل کی جاتی ہے ان میں سعودی عرب سرفہرست ہے۔ اگر قیام پاکستان کے بعد جاری ہونے والے ماہناموں کی فہرست مرتب کی جائے تو غالب امکان ہے کہ یہ آج تک بغیر کسی تعطل کے جاری رہنے اور شائع ہونے والا واحد ماہنامہ قرار پائے۔ ہر دور میں تازہ دم ذہن اس کو نیا خون دیتے رہے۔ آپ کا شکوہ بجا ہے کہ اس کی مارکیٹنگ میں کمی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی اشاعت میں جتنا بھی اضافہ ہوتا ہے وہ ہمارے بے مثال قارئین کی کوششوں سے ہوتا ہے۔ (دنیا میں اپنی نوعیت کی پہلی مثال غالباً!) اس رسالے کی آمدن کا ذریعہ صرف اس کی قیمت ہے اور چند اشتہارات جن سے ماہانہ اشاعت کا خرچ پورا کیا جاتا ہے۔ ادارہ بتول کے مختصر سے سٹاف اور دفتر کے اخراجات ادارے کی کتب کی سیل سے پورے ہوجاتے ہیں۔

پبلسٹی اور مارکیٹنگ کی مد میں ہونے والے اخراجات کے لیے اضافی آمدن کی ضرورت ہے جس کے دو ذرائع ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسالے کی قیمت بڑھا کر مارکیٹ میں موجود عام رسالوں کے برابر لائی جائے۔ مگر اس صورت میں اس رسالے کے ذریعے افادہِ عام کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ اس کی قیمت اسی لیے انتہائی کم رکھی گئی ہے تاکہ ہر شخص کی پہنچ میں رہے اور تحفتاً دینے کے لیے بھی بوجھ محسوس نہ ہو۔

دوسری صورت اشتہارات کی ہے اور اس ضمن میں ہماری مجبوری ہے کہ یہ ہم باتصویر اشتہارات شائع نہیں کرتے۔ جبکہ زیادہ تر کمپنیاں اپنی پراڈکٹ کیلئے تصویر کے بغیر اشتہارات دینے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ اب اس صورتحال میں رسالے کی اشاعت بڑھانے کے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہی کہ حسب سابق ہمارے قارئین کا تعاون ہمیں حاصل رہے۔ البتہ مزید تندہی کے ساتھ ہم سب مل جل کر اس کے خریدار بڑھائیں اور اپنے حلقہ احباب میں اس کو متعارف کرائیں، لائبریریوں اور بک سٹورز پر رکھوائیں۔ مختلف پبلک مقامات جیسے بیوٹی پارلر، کلینک، جم وغیرہ میں اس کو رکھیں۔ تحفتاً دیں اور سالانہ خریدار بنوائیں۔ دوسرا راستہ یہ بھی ہے کہ قارئین میں جو لوگ خود کاروباری ہیں یا کاروباری

لوگوں سے رابطے میں ہیں، وہ اس رسالے کیلئے ایسے اشتہارات لے کر آئیں جن میں جانداروں کی تصاویر کے بغیر پراڈکٹ کو مشتہر کیا گیا ہو۔ اضافی اشتہارات کی آمدن سے ہی امکان پیدا ہوسکتا ہے کہ مارکیٹنگ اور پبلسٹی پر کچھ خرچ کیا جائے۔

آپ جیسے قارئین ہمارا سرمایہ ہیں جو اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالنے کیلئے بے تاب ہیں۔ اللہ ہم سب کی کوششوں کو قبول کرے اور ان میں برکت ڈالے۔ (آمین)

(مدیرہ)

تلبینہ کیا ہے؟

چائے کے وقفے کے دوران سب ہی مزے سے کچھ نہ کچھ کھا پی رہے تھے۔ میں بھی اپنا کپ اٹھائے ان میں شامل ہوگئی۔اچانک ایک ساتھی نے پوچھا۔

''فریدہ! یہ تلبینہ کیا ہوتا ہے؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ آپ بھی مجھ سے مذاق کرنے لگی ہیں۔انہوں نے تھوڑی خفگی کے انداز میں جواب دیا کہ بھلا میں کیوں آپ سے مذاق کروں گی مجھے تو سچ مچ نہیں معلوم کہ تلبینہ کیا ہے۔ان کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے میں نے جلدی سے انہیں انکی مطلوبہ معلومات بہم پہنچانی شروع کردیں۔

دراصل جب سے میں نے تلبینہ کے بارے میں پڑھااوراس سنت کی افادیت کا بھید مجھ پر کھلا،تب سے نہ صرف یہ کہ میں نے خوداس کا استعمال شروع کیا بلکہ اپنی تمام ساتھیوں سے بھی خوب شیئر کیا، کافی لوگوں کواس کی ترکیب لکھ کردی، کچھ کوزبانی بتایا صرف یہی نہیں بلکہ اپنے علاقے میں موجود کچھ ساتھیوں کوجنہیں جوکا دلیہ (چکی کا پسا ہوا) بازار میں تلاش کرنے میں مشکل درپیش تھی انہیں دلیہ منگوا کر بھی دیا تاکہ وہ جلدازجلد اس کا استعمال شروع کردیں۔اب اچانک اس سوال نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ میری کوششیں اتنی بھرپور بھی نہ تھیں جتنی میں سمجھ رہی تھی اوراسی سوچ کے ساتھ مجھے آپ سب کے لئے لکھنے کا خیال آیا۔توجناب سوال ہے کہ تلبینہ کیا ہے؟

ڈاکٹر خالد غزنوی اپنی کتاب''طب نبویؐ اورجدید سائنس''میں رقم طراز ہیں کہ

''جو کوٹ کر انہیں دودھ میں پکانے کے بعد مٹھاس کے لئے اس میں شہد ڈالا جاتا تھا اسے تلبینہ کہتے ہیں۔''(صفحہ۔۵۹)

حیاتِ طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے آپؐ کو اناج میں جو بہت پسند تھے لہٰذا کبھی اس کی روٹی، کبھی ستو اور دلیہ (تلبینہ) کی شکل میں کھاتے تھے۔آپؐ تندرستی کے علاوہ بیماری، پریشانی اور تھکن میں تلبینہ کھانے کا حکم دیتے تھے۔حضرت عائشہؓ کے گھرانے میں جب کسی کی وفات ہوتی تو دن بھر افسوس کرنے والی عورتیں آتی رہتیں پھر جب وہ چلی جاتیں اور صرف گھر والے اورخاص خاص عزیز رہ جاتے تو وہ تلبینہ کی ہانڈی تیار کرواتیں پھر ثرید (شوربے میں روٹی کے ٹکڑے ڈال کر پکائیں تو اس کو

''ثرید'' کہتے ہیں) بنوا کر تلبینہ اس پر ڈلواتیں اور اسے کھانے کا حکم دیتیں۔ وہ فرماتی تھیں کہ میں نے نبی کریمؐ کو فرماتے سنا ہے کہ تلبینہ سے بیمار کے دل کو تسکین ہوتی ہے اور اس کا غم کسی قدر ہلکا ہو جاتا ہے۔ (بخاری)

مجھے ذاتی طور پر تلبینہ بہت پسند ہے کیونکہ یہ ایک بہترین ناشتہ ہے۔ آپ چاہیں تو اس میں مرضی کے فریش فروٹ مثلاً کیلے، آم، انگور، آڑو، سیب یا ڈرائی فروٹ مثلاً بادام، کشمش، انجیر، کاجو، پستے، کھجور اور اخروٹ وغیرہ بھی شامل کر سکتی ہیں اس طرح بچے بھی خوشی خوشی اسے کھا لیتے ہیں۔ یقین جانیئے یہ ایک بھرپور ناشتہ ہے جو زود ہضم ہونے کے ساتھ ہی بہت صحت منداور خوش ذائقہ بھی ہے۔ یہ آپ کو دن بھر Energetic اور خوش وخرم رکھنے میں بھرپور کردار ادا کریگا۔ اس کے علاوہ وزن گھٹانے میں جَو اور شہد کی افادیت کو آج دنیا مان گئی ہے لہٰذا وہ افراد جو اپنا وزن کم کرنا چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے ناشتے میں تلبینہ کھائیں اور اپنی دن بھر کی خوراک میں جَو کا استعمال بڑھا دیں۔ مثلاً جو کو سادہ پانی میں ابال کر اس میں کوئی بھی سالن شامل کر کے بالکل اسی طرح کھایا جا سکتا ہے جیسے عموماً ہم چاول کا استعمال کرتے ہیں۔

جی جناب تلبینہ کے فوائد تو ہم سب کو معلوم ہو گئے لیکن ان سے صحیح معنوں میں فائدہ صرف وہی اٹھا سکتا ہے جو اسے سنت سمجھتے ہوئے خود استعمال کرے، اور دوسروں کو بتائے، اپنے اور اوروں کے غم دور کرے اور صحت کے ساتھ ساتھ سنت پر عمل کرنے کا اجر بھی آخرت میں پائے۔ امید ہے اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ تلبینہ کیا ہے تو آپ سب بھی اس کو بخوبی جواب دے سکتے ہیں۔

☆☆☆

بتول میگزین

ہدایت کا سفر

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

قیام آسٹریلیا کے دوران میلبورن شہر میں میری ملاقات ایک نومسلم خاتون امینہ سے ہوئی، جس نے تین سال قبل اسلام قبول کیا تھا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک کالے رنگ کی عبا میں ملبوس تھی اور سر پر حجاب تھا صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن پر اس نے رنگین چشمہ لگا رکھا تھا۔ انٹرویو کے دوران جب پردے کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں بزربن کی رہنے والی ہوں، یونیورسٹی میں انٹرنیٹ پر میں نے اسلام کے بارے میں پڑھا اور جانا پھر مسلم طالب علموں سے جو مصر کے رہنے والے تھے مزید کتابوں کا مطالعہ کیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد سب سے پہلا کام ''حجاب'' کا عملی استعمال تھا۔ میرے والدین نے مجھ پر سختی کی، دوستوں نے مذاق اڑایا، والد صاحب نے خرچ دینا بند کر دیا۔ میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔ مجھے اتنا تنگ کیا گیا کہ اس شہر میں میرا رہنا دشوار کر دیا گیا چنانچہ میں نے ہجرت اختیار کی اور ملبورن چلی آئی۔ الحمدللہ یہاں بہت مسلمان ہیں وہ سب میرے خاندان کی طرح ہیں۔ میں پردے میں جس جگہ بھی ملازمت کے لئے گئی مجھے انکار کر دیا گیا اس طرح مجھے مسلمان ہونے کی سزا دی گئی لیکن میں نے اپنے اللہ سے دعا مانگی کہ وہ مجھے استقامت عطا کرے۔ آخر کار مجھے مسلم سکول میں ملازمت مل گئی۔

حجاب کے استعمال کے بعد مجھے جو پاکیزگی اور تحفظ کا احساس ملا ہے سمندر کے کنارے سن باتھ لینے والی لڑکیاں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ میں اپنی ہی نظروں میں باوقار اور باعزت ہوگئی ہوں۔ اب کسی لڑکے کی جرات نہیں ہوسکتی کہ وہ مجھے دعوت گناہ دے۔ مجھے زبان سے کچھ نہیں کہنا پڑا بس صرف ''نو ویکنسی'' کا بورڈ آویزاں کیا ہے۔

میرے لباس کا خرچ کم ہوگیا ہے۔ لباس مہنگا ہو

یا سستا۔اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔اور بہت زیادہ لباس کےنوقت نےکیادوحصوں میں تقسیم کرلیں۔آدھے وقت میں پڑھیں اور باقی
زحمت سے بچ گئی ہوں۔کیونکہ یہ عبا میرے لئے کافی ہے۔آدھےوقت میں جو کچھ پڑھا ہے اسے تحریر کی شکل میں لے آئیں تا کہ
کے دوران میں اس کے اندر بہت آسانی محسوس کرتی ہوں اوہ آپناگاہبت سے اورلوگوں تک پہنچ سکے۔اس کے بعد انہوں نے
کرسکتی ہوں۔ نشرواشاعت کے ضمن میں بہت سے مفید مشورے دیے کہ کس طرح
اللہ کی طرف سے عورت کے لئے اس سے بڑا تحفہ کوئیاوہوسلہ جو بظاہر اخبار میں نہیں چھپتا مگر مدیر کی رائے بنانے میں
ہی نہیں سکتا میں اکیلی تھی۔خوف زدہ تھی، اور برز بن سےدگاوہوتا ہے اور جب بہت سے مراسلے کسی موضوع پر موصول ہوتے
آرہی تھی اگر میں پردے کے بغیر ہوتی تو میرے رشتے دارہیاتولیےاس پر ادار یہ بھی لکھ دیتا ہے اس فکرانگیز خطاب کے کچھ عرصہ
ہم مذہب نہ صرف یہ کہ مجھے ذلیل وخوار کرتے ،میری عزبعدمحترم صلاح الدین نے صحافت کے ذریعے جہاد کے راستے میں
تارتار کرتے بلکہ بہت ممکن تھا وہ مجھے قتل کردیتے لیکن اللہشہادت کا رتبہ پالیا۔ان کا یہ پیغام آج بھی ہمیں دعوتِ عمل دے رہا ہے
طرح میری حفاظت کی۔کہ وہ میری بوسونگھتے پھرے کہ امجھنے حصے کا دیا ضرور جلانا ہے،خوشبو کو عام کرنا ہے،رب کی دی ہوئی
ڈھونڈتے رہے اور میں اسی کوچ میں سفر کررہی تھی ،انہوں تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ،اس دعا اور امید کے ساتھ کہ
کوئی مسلمان خاتون سمجھتے ہوئے میری طرف نظر اٹھا کوہ بھی نہیں والجلال ہماری چھوٹی چھوٹی کوششوں کو قبولیت بخشے آمین۔
دیکھا اور میں اطمینان سے اتری اور ٹیکسی لے کراپنی ایک مسلمان ☆☆☆
دوست کے گھر چلی گئی۔جب میں نے اسے یہ واقعہ سنایا تو وہ حیران پیاس
رہ گئی۔میں نے کہا حیرانی کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ام صائم
میرا ایمان اور پختہ ہوگیا ہے اس کا وعدہ ہے کہ اس کی اطاعت کرآتے حضرت حاجرہؑ کا واقعہ پڑھتے پڑھتے میری سوچ حضرت
ہوئے جب اسکی راہ میں نکلو گے تو وہ تمہاری حفاظت کرےاسمٰعیلؑ کی پیاس اور حضرت حاجرہؑ کی اپنے بیٹے کی پیاس بجھانے کی
سومیرے رب نے میری حفاظت کی۔ لئے جدوجہد پر آکر ٹھہر گئی۔
اس نے کہا کہ ساری دنیا کی مسلمان عورتوں سے میری سوچ نے رخ موڑا تو آج کے نوجوان بچوں اور بچیوں کی طرف
درخواست ہے کہ وہ ضرور حجاب اختیار کریں اس میں نجات ہےچلی گئی جن کی روح پیاسی ہے اور اس پیاس کو بجھانے کی جدوجہد کرنے
☆☆☆ کے لئے آج کی ماں کے پاس وقت نہیں اور پھر یہ پیاس ان بچوں کو
دیا جلانا ہے سگریٹ، چرس، ہیروئن اور شیشہ پینے پر مجبور کررہی ہے۔
ڈاکٹر مسز آفاق۔لاہور ذمہ داری تو باپ کی بھی برابر ہے لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ اللہ
کئی برس پہلے کی بات ہے کہ جمعیت طالبات کا سالانہ اجتماع اس کے رسولؐ نے ایک ماں کو مقام کیا دیا ہے تین درجے ماں کا
ہورہا تھا،کراچی سے مدیرِ تکبیر محترم صلاح الدین صاحب، طالبات چوتھا درجہ باپ کا۔اور پھر اللہ پاک نے اپنی محبت کو ناپنے کا پیمانہ
خطاب کررہے تھے،اس موقع پر انکی تقریر کے الفاظ اکثر ذہنوں کیاتو ماں کی محبت سے۔یعنی اللہ پاک اپنے بندے سے ستر ماؤں
گونجتے ہیں اجب انہوں نے کہا کہ آپ طالبات ہیں، دینی لٹریچر پڑھتی ہے پھر فرمادیا کہ ماں راضی تو رب راضی اور جس سے رب
ہیں اور اسے وقت دیتی ہیں۔آپ کیوں نہیں ایسا کرتیں کہ اپنے پڑھنےکا ٹھکانہ جنت ہے۔تو ظاہر سی بات ہے جس کا مقام، رتبہ،

عہدہ جتنا بڑا ہوگا ذمہ داری بھی اتنی ہی بڑی ہوگی۔ لیکن آج ہم مائیں اپنا زندگی اور یہ وقت ہمارے لئے مہلتِ عمل ہے، جو دن بدن کم
یہ مقام بھول چکی ہیں یا پھر جانتی ہی نہیں۔ پھر سوچ نے رخ پلٹا ہو رہی مجھ پہ۔ ہر گزرتا لمحہ ہمیں موت سے قریب کر رہا ہے۔ وہ موت
آکر رک گیا کہ میں بھی تو ایک ماں ہوں میرا بچہ جب گرمی ہماری سکت عمل چھین لے گی۔ بقول شاعر
سے آتا ہے تو اس کے لئے ٹھنڈا میٹھا شربت تیار رکھتی ہوں اس کے آرام فرصتِ زندگی بہت کم ہے
کا خیال کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ لائٹ آتی رہے تا کہ آتے ہی مُغتنم ہے جو دید، وہ کم ہے
اسے کچھ سکون تو ملے۔ مگر نماز کا پوچھنا ضروری نہیں سمجھتی۔ اور اس وقت تو برحق اور یقینی ہے۔ جب یہ خوبصورت جسم گلنا شروع
میں یہ کیوں بھول جاتی ہوں کہ نبیؐ کا آرام اور نبیؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو جائے گا، جب منوں مٹی تلے دبانا گھر والوں اور پیاروں کی مجبوری
نماز میں تھی اور یہ بھول جاتی ہوں کہ یہ ٹھنڈا میٹھا شربت اور ٹھنڈک آج اگر ہم نے اپنے وقت کو صحیح انداز میں رب کی رضا کی خاطر
اس بچے کو حشر کے دن کی پیاس اور گرمی سے نہ بچا سکے گا۔ خرچ کیا تو کل یقیناً ہمیں پچھتاوا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پکار رہا ہے
کہنے کا مقصد یہ نہیں یہ بچوں کو یہ ساری سہولتیں دی نہ جائیں دوڑو اپنے پروردگار کی بخشش اور جنت کی طرف جس کا عرض زمین
نہیں! بلکہ حضرت حاجرہؑ کی کوشش اور دعائیں تو یہ بتا ہی رہی اور آسمان کے عرض کا سا ہے۔''

☆☆☆

کے ساتھ ایک عورت، ایک بیوی اور ایک ماں کو اس کی ذمہ داری کا احساس بھی دلا رہی ہے کہ اپنا آپ بھول کر اولاد کی تربیت، پرورش کے لئے دوڑو، محنت کرو، اللہ سے دعائیں کرو۔ آج اصل پیاس روح کی پیاس ہے جو علم نہ ہونے کی وجہ سے گمراہی اور بے راہ روی کی طرف لے جا رہی ہے۔

☆☆☆

پونجی ختم ہوئی

ام فاطمہ۔ کراچی

فرشتے نے دریافت کیا، ''حضرت آپ اس دنیا میں ساڑھے نوسو سال رہے اب جاتے وقت کیا احساسات ہیں؟'' حضرت نوحؑ نے فرمایا: ''مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کمرے کے دو دروازے ہیں ایک سے داخل ہوا اور دوسرے سے نکل رہا ہوں۔''

جی ہاں! یہ ہے وہ موت جس کی جانب ہماری زندگی کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ اس برق رفتاری کا اندازہ ہم ماضی میں جھانک کر کر سکتے ہیں۔ تیس، چالیس سال یا اس سے زیادہ وقت ہم اس فانی دنیا میں گزار چکے ہیں، لیکن یہ ایک لمحے کی بات لگتی ہے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیسے اتنا وقت گزر گیا۔ ہم کتنے ہی دولت مند اور بااختیار کیوں نہ ہوں گزرتے وقت کو نہ تو روک سکتے ہیں اور نہ ہی گزرے وقت کو واپس لا سکتے ہیں۔